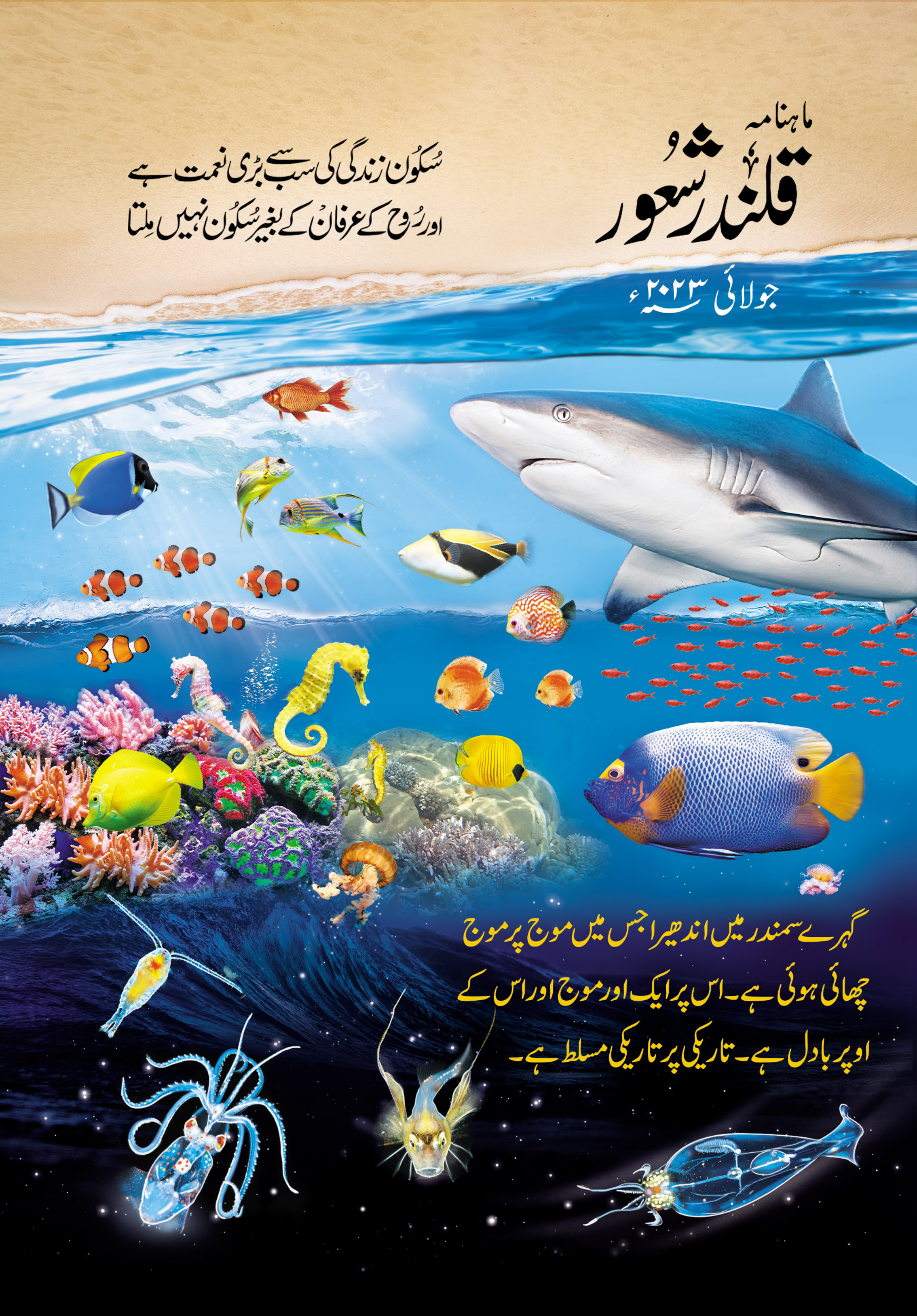
ماہنامہ
قلندر شعور
جولائی ۲۰۲۳ء
سکون زندگی کی سب سے بڑی نعمت ہے
اور روح کے عرفان کے بغیر سکون نہیں ملتا
گہرے سمندر میں اندھیرا جس میں موج پر موج
چھائی ہوئی ہے۔ اس پر ایک اور موج اور اس کے
اوپر بادل ہے۔ تاریکی پر تاریکی مسلط ہے۔

دل گداز
خواتین و حضرات کے نام

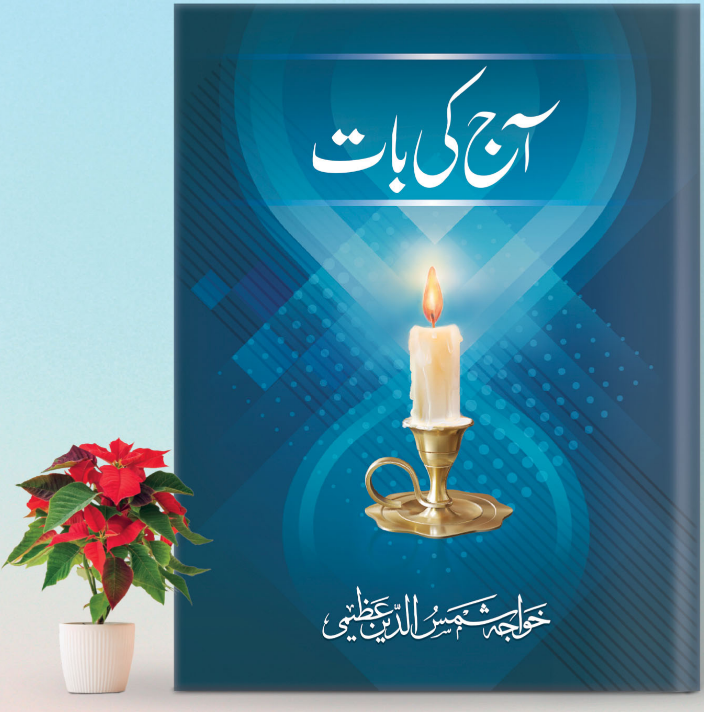

ملنے کا پتہ : عظیمی یونیورسٹی پریس® کراچی
رابطہ نمبر : +92-213-6417843

زیر سرپرستی

اللہ کے دوست حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی

فری ممبرشِپ

عظیمیہ روحانی لائبریری

جنڈ، اٹک

روحانی علوم کے متلاشی خواتین و حضرات، راہِ سلوک کے مسافر اور روحانی سائنس میں دلچسپی رکھنے والے طلبہ و طالبات کے لئے عظیمی صاحب کی تحریر کردہ اور تصوف کی دیگر کتابیں مطالعہ کے لئے موجود ہیں۔

اوقات: عصر تا مغرب روزانہ

حاجی بازار، جنڈ، اٹک۔ موبائل نمبر: 03009145175

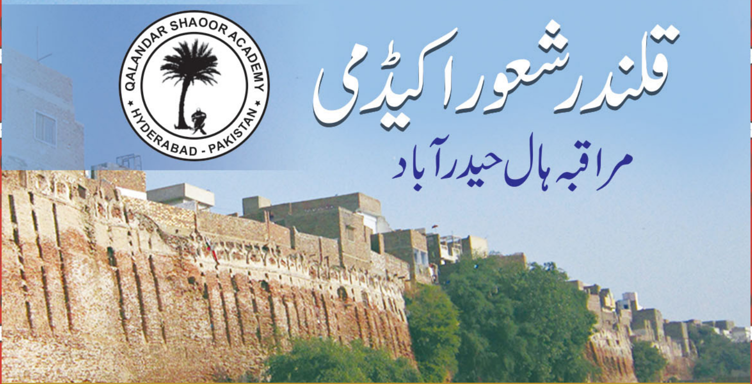

زیر سرپرستی خانوادہ سلسلہ عظیمیہ

قلندر شعور ہماری رہنمائی کرتا ہے کہ ہم کائناتی تخلیقی فارمولوں کے تحت اپنے اندر روحانی صلاحیتوں کو متحرک کر سکتے ہیں۔

روحانی علوم کے متلاشی، راہِ سلوک کے مسافر اور روحانی سائنس میں دلچسپی رکھنے والے خواتین وحضرات کے لئے خوش خبری

گلشن شہباز، نزد ٹول پلازہ، جامشورو حیدرآباد، 71000 ، پاکستان

فون نمبر: 0331-3615533 ، 0333-2695331

DEFENCE
3D - OPG - CEPH

3 DIMENSIONAL DENTAL IMAGING CBCT SYSTEM

KARACHI

3D

Free software provide with implant library to all consultant for Nerve Tracing. Cephalomatric Tracing, Implant Planing.

Maxillofacial

Implant Planning

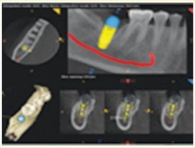

OPG

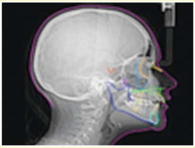

CEPH

Take Your Practice to the Next Level !

Defence branch:
0213-8941506 - 0343-7180348
Building # 7-C, Shop # 1, Street 10, Badar Commercial Area, Phase 5 Ext. DHA, Karachi.

Sharfabad branch:
0213-4920777 - 0320-4690899
Plot # 87, Shop # 2, Zulekha Tower, Block-3, BMCH Society, Main Jamal-ud-Din AfghaniRoad, Sharfabad, Karachi.

Email: info@3d-diagnostic.pk Web: www.3d-diagnostic.pk

ONLINE COACHING

From class 9th to BSc

Tania Riaz

Qualification:

BSc in Double Maths & Physics

Experience:

6 Years of experience in Teaching

Subjects to Teach

- Mathematics
- Physics
- Computer

More Info

GMAIL
taniariaz551@gmail.com

Call us
+92 332 8875 840

A GREAT PLACE TO LEARN ONLINE

5th to Msc for all subject

- One paper preparation
- General Knowledge

Enrol Now

More Info

GMAIL
azka.info94@gmail.com

Call us :
+92 300 1208419

جلد 11 شمارہ 6 | جولائی 2023ء | ذوالحج ۔ محرم 45-1444ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ماہنامہ

قلندر شعور کراچی

Neutral Thinking

(اردو۔انگریزی)

سرپرست اعلیٰ

حضور قلندر بابا اولیاء رحمۃ اللہ علیہ

چیف ایڈیٹر

خواجہ شمس الدین عظیمی

ایڈیٹر

حکیم سلام عارف

سرکولیشن منیجر

محمد ایاز

بااہتمام عظیمی یونیورسٹی پریس ۔۔۔ پبلشر شاہ عالم عظیمی نے ابن حسن آفسیٹ پرنٹنگ پریس، ہاکی اسٹیڈیم، کراچی سے چھپوا کر شائع کیا۔

فی شمارہ 130 روپے.....سالانہ ہدیہ 1944 روپے رجسٹرڈ ڈاک کے ساتھ، بیرون پاکستان 75 امریکی ڈالر سالانہ

B-54، عظیمی محلّہ، سیکٹر C-4 سرجانی ٹاؤن کراچی، پاکستان۔فون نمبر: 6912020 (0)213 92+

انا للہ وانآ الیہ رٰجعون

جنوبی یونان کے ساحل کے قریب تارکینِ وطن کی کشتی ڈوبنا انتہائی تکلیف دہ حادثہ ہے۔ یہ کرب ناک حادثہ پوری قوم کے لئے لمحۂ فکریہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ڈوبنے والے افراد کے درجات بلند فرمائے اور ان کے والدین، بہن بھائی اور بیوی بچوں کو صبرِ جمیل عطا فرمائے، آمین۔

(ادارہ ماہنامہ قلندر شعور)

۲۸ مضامین کا گُل دان

حمد باری تعالیٰ ____ محمد منظور حسین (حافظؔ) 10

نعت رسول مقبول ﷺ ____ مولوی عزیزؔ الحق 11

رباعیات ____ ابدالِ حق حضور قلندر بابا اولیاؒ 12

آج کی بات ____ مدیر مسئول 14

فقیر کی ڈاک ____ ادارہ 18

امتحان کا نتیجہ ____ ... 21

ڈھول کی تھاپ ____ ملک محمد ناصر 27

فلاخن ____ (M.A.Fine Arts) حامد ابراہیم 33

عنوان — قارئین بتائیں ____ عابد محمود 41

لباس کیا چاہتا ہے—؟ ____ گلِ نسرین 45

سمندر کیا ہے—؟ ____ (M.Sc.Botany) خالدہ زبیر 51

برگِ سبز ـــــ عبداللہ 57

وہیل اور بلّی ـــــ اظہر حسین 63

تین کرامات ـــــ تالیف 67

یہ جو دیوانے سے دو چار نظر آتے ہیں ـــــ عفت جبیں 75

کِس نے سنا ـــــ عرفانہ شہزاد 79

اقتباسات ـــــ خواتین و حضرات 84

لکھنؤ کا دسترخوان | ساقی رہا نہ وہ زمانہ رہا ـــــ مرزا جعفر حسین 85

مئی 2023ء کے سرورق کی تشریح ـــــ قارئین 91

آئینہ ـــــ (متحدہ عرب امارات) بی بی انور ادھا 95

پورب کے ہم زاد ـــــ (M.Sc. Applied Physics) محمد عدنان خان 101

جستجو کیا ہے ـــ؟ ـــــ (Ph.D.) ڈاکٹر نعیم ظفر 109

الفاظ کا اسیر ـــــ نفیسہ شاکر 113

آپ کے خواب اور ان کی تعبیر ـــــ عظیمی خواجہ شمس الدین 119

125 Shahzad Amir ______ The Light Within Mankind

130 Momina Shahid ______ Thought

135 ... ______ Results of the Test

138 K. S. Azeemi ______ Message of the Day

حمد باری تعالیٰ

محمد منظور حسین (حافظؔ)

زبانِ خلق پر ہر آن حمدِ حق تعالیٰ ہے
اسی کے نام کی برکت سے دنیا میں اجالا ہے

کیا اس نے مزّین آسماں کو چاند تاروں سے
شبِ تاریک کے پردے سے سورج کو نکالا ہے

بلندی کوہساروں کی، روانی آبشاروں کی
ہر اک منظر جہاں کا اس کی قدرت کا حوالا ہے

سفینوں کو حفاظت سے وہی لاتا ہے ساحل تک
اسی کے لطفِ پیہم نے ہر اک مشکل کو ٹالا ہے

اسی کا ذکر ہے لب پر اسی کی یاد ہے دل میں
اسی کا در نگاہوں کو بصیرت دینے والا ہے

اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے جو کچھ جہاں میں ہے
وہی فرمانروائے دہر ہے، وہ ربِ اعلیٰ ہے

کرے تو کیا کرے حافظؔ ثنائے خالقِ اکبر
ہر اک تخلیق جس کی فہمِ انسانی سے بالا ہے

نعت رسول مقبول ﷺ

مولوی عزیزؔ الحق

رسولِؐ خدا رحمۃ للعالمیں ہیں
شہِ دوسرا فخرِ دنیا و دیں ہیں

وہ دارالفنا ہو کہ دارالبقا
یہ دونوں جہاں ان کے زیرِ نگیں ہیں

انہی کی بدولت ہیں جملہ خلائق
زمیں پر ہیں جو یا کہ زیرِ زمیں ہیں

جہاں میں ہیں جتنے حکیم اور عاقل
اسی خوانِ حکمت کے سب خوشہ چیں ہیں

وہ لطفِ سراسر وہ خلقِ مجسم
فدا حسن ہو جن پہ ایسے حسیں ہیں

ہیں عقل اور عشق ان کے آگے نگوں سر
وہ ذہنوں پہ چھائے ہیں اور دلنشیں ہیں

عزیزِؔ حقیر اور نعت پیغمبرؐ
جو محمودِ خلّاقِ عرشِ بریں ہیں

چشم ــ گوش ــ دل

مٹی کے سبو شراب کی محفل ہیں
نظاروں سے دنیا کے مگر بے دل ہیں
یہ دیکھتے سنتے ہیں، سمجھتے بھی ہیں
ذرّات میں ان کے چشم و گوش و دل ہیں

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

”اس سے ذرّہ برابر کوئی چیز نہ آسمانوں میں چھپی ہوئی ہے نہ زمین میں۔ نہ ذرّے سے بڑی اور نہ اس سے چھوٹی۔ سب کچھ ایک نمایاں دفتر میں درج ہے۔“ (سبا: ۳)

شے کی موجودگی حواس سے ہے اور حواس روح کی تحریکات ہیں۔ جن چیزوں کو بے جان سمجھا جاتا ہے، وہ مٹی اور پانی سے تخلیق ہوئی ہیں۔ مٹی اور پانی جاندار ہیں، ان کے مجموعے سے طرح طرح کے اجسام بنتے ہیں۔ پانی کے ایک قطرے میں نقش و نگار پنہاں ہیں تو مٹی بھی ذرّات پر مشتمل متحرک وجود ہے۔ ذرّہ وجود کی اکائی ہے۔ یہ ضرب در ضرب ہو کر نقش و نگار میں ظاہر ہوتا ہے۔ ذرّہ چھوٹا یونٹ تصور کیا جاتا ہے لیکن یہ مکمل وجود ہے اور اس کے اندر پوری کائنات ہے۔ ذرّے میں برسرِعمل فارمولے ردّوبدل ہو کر تخلیقات کا روپ اختیار کرتے ہیں۔

ابدالِ حق فرماتے ہیں کہ مٹی کے جام میں اسرار و رموز پنہاں ہیں۔ جام جس matter سے تشکیل ہوا ہے، وہ آنکھ، کان اور دل رکھتا ہے — دیکھتا ہے، سنتا ہے اور اسے حقائق کا ادراک ہوتا ہے۔ مشروب کے پیالے کی طرح آدمی کا جسم بھی مٹی کا جام ہے جو دیکھنے، سننے اور سمجھنے والے ذرّات سے مرکب ہے لیکن آدمی عدم دل چسپی کی وجہ سے اللہ کی نشانیوں کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ اگر وہ اپنی تخلیق اور کائنات میں تخلیقات پر غور کرے تو اسے ہر وجود میں ذرّہ متحرک نظر آئے گا۔ ذرّے کی تحریک پر غور نہ کرنے والا فرد، اللہ کی نشانیوں سے غافل ہے۔ اگر فرد وجود کی ابتدا کی طرف متوجہ ہو جائے تو ذرّہ اس کے لئے مسخر ہو جائے گا اور اندر میں تخلیقی فارمولے اس پر کھل جائیں گے۔

آج کی بات

کائنات میں شماریات سے زیادہ دنیائیں ہیں۔ ہر دنیا ایک زمین ہے اور زمین کے لئے آسمان سائبان ہے۔ آسمان کے سات طبقات ہیں۔ زمین کے طبقات بھی سات ہیں۔ تمام طبقات میں ہماری طرح مخلوقات آباد ہیں جن کے لئے وسائل کی فراہمی کا ایک مکمل اور مربوط نظام جاری وساری ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے،

> ”اللہ وہ ہے جس نے سات آسمان بنائے اور اسی کے مثل زمینیں بھی۔ اس کا حکم ان کے درمیان اترتا ہے تاکہ تم جان لو کہ اللہ ہر شے پر قادر ہے اور یہ کہ اللہ کا علم ہر شے پر محیط ہے۔“ (الطلاق: ۱۲)

آسمانوں اور زمین میں کوئی مقام ایسا نہیں جو اللہ کے حکم سے خالی ہو۔ خالی نظر آنے والی فضائیں رنگین ہیں۔ ان فضاؤں میں زندگی سانس لے رہی ہے، زندگی سے زندگی بن رہی ہے اور زندگی — زندگی میں چھپ رہی ہے۔ خلا کو خالی سمجھنا آدمی کے دماغ کے 12 کھرب خلیوں میں اُن خلیات کا چارج نہ ہونا ہے جن کا تعلق خلا میں زندگی سے ہے۔ زمین و آسمان کا ہر طبقہ اللہ کی قدرت کا اظہار ہے اور ہر مظاہرے پر اللہ کا علم محیط ہے۔

وسائل آسمان سے زمین پر منتقل ہوتے ہیں۔ وسائل لاشمار ہیں لیکن ان کی تخلیق جس شے سے ہوئی ہے، وہ ایک ہے۔ تخلیقات کی اس اکائی کو قرآن کریم میں ”ماء“ کہا گیا ہے جس کا عام ترجمہ پانی کیا جاتا ہے۔ باطنی علوم میں ماء ایک وسیع اصطلاح ہے جس کا تعلق رنگ اور روشنی دونوں سے ہے۔ ساری مخلوقات ایک پانی سے سیراب ہوتی ہیں مگر پانی ایک نہیں کہ قدرت نے اس میں ہر تخلیق کی مقداریں رکھی ہیں۔ مقداروں سے قسم قسم

کی مخلوقات اور عجائبات ظاہر ہوتے ہیں۔ جب غور وفکر کرنے والے خواتین و حضرات پانی میں نیرنگی دیکھتے ہیں تو انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں۔

••———————••

قرآن کریم میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے،

"اللہ وہ ہے جس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا اور آسمان سے پانی برسایا۔ پھر اس کے ذریعے سے تمہاری رزق رسانی کے لئے طرح طرح کے ثمرات پیدا کئے۔ جس نے کشتی کو تمہارے لئے مسخر کیا کہ سمندر میں اس کے حکم سے چلے اور دریاؤں کو تمہارے لئے مسخر کیا۔ جس نے سورج اور چاند کو تمہارے لئے مسخر کیا کہ لگاتار چلے جارہے ہیں اور رات اور دن کو تمہارے لئے مسخر کیا۔ جس نے وہ سب کچھ تمہیں دیا جو تم نے مانگا۔ اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تو نہیں کرسکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان بڑا بے انصاف اور ناشکرا ہے۔" (ابراھیم: ۳۲۔۳۴)

آیات کے ہر نکتے میں تخلیقی فارمولے اور علم کا اظہار ہے۔

(۱) آسمانوں اور زمین کی پیدائش
(۲) آسمان سے پانی برسنا
(۳) پانی سے طرح طرح کے ثمرات (وسائل) ظاہر ہونا
(۴) کشتی کا مسخر ہونا اور سمندر میں پانی کا کشتی کے لئے راستہ بنانا
(۵) دریاؤں کا مسخر ہونا
(۶) چاند سورج کی تسخیر اور دونوں کا تسلسل سے اپنے دائرے میں تیرنا
(۷) دن اور رات کے حواس (علوم) پر دسترس
(۸) ضرورت کی ہر شے اور شے کا علم عطا ہونا
(۹) آدمی کی شماریات سے زیادہ انعامات (علوم)

آیات اور فارمولوں کو اسی ترتیب سے ڈائری میں لکھئے اور اندر کی روشنی میں سمجھئے۔

احسن الخالقین اللہ کی کبریائی ہے کہ وہ ماؤں کے رحموں میں پانی سے جیسی چاہتا ہے، صورتیں بناتا ہے۔ زمین ماں ہے۔ بارش کا پانی زمین میں داخل ہوتا ہے تو زمین میں موجود ڈائیوں کے مطابق اندر میں رنگوں کو ظاہر کرتا ہے۔ ڈائیاں کیا ہیں اور کس طرح مختلف ہیں— جڑواں بچوں کی مثال سے سمجھئے۔ رحم میں ہر بچے کی ڈائی الگ ہوتی ہے۔ دونوں کو ایک غذا ملتی ہے، وہ غذا جو ماں کھاتی ہے مگر ڈائی مختلف ہونے سے جہاں بعض جڑواں بچے ایک دوسرے سے غیر مشابہ ہوتے ہیں، وہاں انتہائی حد تک شباہت رکھنے والے جڑواں بچوں کی بھی شکل و صورت اور جسامت میں فرق ضرور ہوتا ہے۔ یہی صورت اماں زمین کے بطن میں نشو و نما پانے والی مخلوقات کی ہے۔

خالقِ کائنات اللہ نے ہر شے پانی سے پیدا کی ہے اور مخلوق کے لئے پانی کو مسخر کر دیا ہے۔ قابلِ غور ہے کہ ہم جسے پانی سمجھتے ہیں، وہ پانی کی محض ایک حالت مائع* ہے جب کہ پانی اپنی تمام حالتوں کے ساتھ پانی ہے— دیگر حالتیں ٹھوس، گیس، ہیولا اور روشنی وغیرہ ہیں۔ اس حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے سورۂ ابراھیم کی آیات پر تفکر کریں تو سمندر سے لے کر چاند سورج اور دن رات کی تسخیر، ہر نکتے میں پانی کے نظام کا انکشاف ہوتا ہے۔

مثال اللہ تعالیٰ نے کشتی کو انسان کے لئے مسخر کیا ہے۔ کشتی لکڑی اور دھاتوں سے بنتی ہے۔ انسان کو علم عطا کیا گیا ہے کہ وہ لکڑی اور دھاتوں پر تصرف کر کے کشتی بناتا ہے اور اللہ کے حکم سے اس کی بناوٹ میں اس ٹیکنالوجی سے استفادہ کرتا ہے جس سے کشتی سمندر میں چلتی ہے۔ تصرف یہ بھی ہے کہ انسان علم حاصل کر کے پانی میں ان مقداروں کو یکجا کر سکتا ہے جن سے لکڑی اور دھاتیں بنتی ہیں۔ کشتی جب دریا اور سمندر میں چلتی ہے تو اس کا وزن اپنے محیط* کے مطابق پانی کے اس حصے کے برابر ہوتا ہے جس میں کشتی موجود

---

* مائع (Liquid) * محیط (Circumference)

ہے اسی لئے کشتی ڈوبتی نہیں۔ جہاں وزن غیر متوازن ہوتا ہے، کشتی ڈوب جاتی ہے۔ جب کوئی شے مسخر ہوتی ہے تو اس شے سے منسلک نظام کا علم جتنا اللہ چاہے، انسان کو حاصل ہو جاتا ہے۔ قارئین ان آیات میں غیر جانبدار ذہن سے تفکر کریں تو رموز منکشف ہوں گے اور اندر میں تخلیقی صلاحیتیں بیدار ہوں گی۔

• • ———————— • •

خالقِ کائنات اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے،

> "اللہ وہ ہے جس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا اور آسمان سے پانی برسایا۔ پھر اس کے ذریعے سے تمہاری رزق رسانی کے لئے طرح طرح کے ثمرات پیدا کئے۔" (ابراھیم : ۳۲)

ثمرات کے معنی وسائل ہیں اور وسائل سے مراد غذا، پھل، پھول، پودے، دھوپ، چھاؤں، ہوا، ہوا میں نمی، سونا، چاندی، لکڑی، دھات، معدنیات، دیدہ نادیدہ مخلوقات اور زمین پر زندگی کی ضروریات ہیں۔ تمام وسائل کی مقداریں پانی میں ہیں اور پانی سماوات سے نازل ہوتا ہے۔ ہماری دنیا کی طرح پانی بھی دنیا ہے۔ اگر نوعِ آدم اور نوعِ جنات کے خواتین، مرد اور بچے پانی کا علم حاصل کرلیں اور پانی کے حقیقی فارمولے سے واقف ہو جائیں تو اس مقام تک رسائی کے راستے کھلتے ہیں جہاں سے پانی آتا ہے۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے،

> "جو لوگ میرے لئے جدوجہد کرتے ہیں، میں ان کے لئے اپنے راستے کھول دیتا ہوں۔" (العنکبوت : ۶۹)

اللہ حافظ

خواجہ شمس الدین عظیمی

فقیر کی ڈاک

تفکر ـــ ذہن کی دنیا میں داخل ہونے کا راستہ ہے۔ تفکر سے خیال کی گہرائیاں روشن ہوتی ہیں۔ گہرائی میں تخلیقی رموز کے خزینے ہیں جن تک رسائی ـــ عرفانِ نفس اور معرفتِ الٰہی ہے۔ ''فقیر کی ڈاک'' اذہان کی آبیاری ہے جس میں مرشد کریم خواجہ شمس الدین عظیمی صاحب شعور کے تانے بانے کو لاشعور سے جوڑ دیتے ہیں۔

محترم عظیمی صاحب ـــ السلام علیکم ورحمۃ اللہ،

میں خوش حال زمیندار تھا۔ معاشی حالات سے پریشان ہو کر ٹرانسپورٹ کا کام شروع کیا لیکن پے در پے نقصانات سے کاروبار ختم اور ذرائع آمدنی مفقود ہوگئے۔ میں نے دولت عیش و عشرت میں نہیں اڑائی پھر تنگ دستی کی سزا کیوں ملی؟ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ کوئی خطا ہوئی ہے تو سزا مجھے ملنی چاہئے تھی، میرے معصوم بچوں کا کیا قصور ہے؟ دل میں بغاوت کے جذبات ہیں، ان سے نجات چاہتا ہوں۔ جاننا چاہتا ہوں کہ یہ کون سا نظام ہے جس میں آدمی ناکردہ خطاؤں کی سزا پاتا ہے۔

دعا کا طالب۔ محمد فیضان خان (کراچی)

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ،

آپ نے خط میں ایسی باتیں لکھی ہیں جن کی وضاحت سے بہت سارے بچوں کو مایوسی، ناامیدی اور بیزاری کی دلدل سے نکلنے کا راستہ ملے گا اس لئے خط کا جواب اس کالم میں لکھ رہا ہوں۔

آدمی ایسی زندگی چاہتا ہے جو فنا سے ناآشنا ہو۔ ایسی صحت چاہتا ہے جو بیماریوں سے متاثر نہ ہو۔ ایسی جوانی چاہتا ہے جو بڑھاپے میں تبدیل نہ ہو لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا ـــ جوانی بڑھاپے میں تبدیل ہو جاتی ہے، صحت و تندرستی کے اوپر بیماریوں کا غلبہ ہوتا رہتا ہے، آدمی زندگی کے نشیب و فراز سے کتنا ہی

فرار چاہے، وہ کامیاب نہیں ہوتا اس لئے کہ فنا کا عمل جاری و ساری ہے۔ آدمی کے اوپر جب پریشانی کا غلبہ ہوتا ہے تو وہ زیادہ حساس ہو جاتا ہے۔ تکلیف اور غم کے عالم میں ایسے ایسے احساسات ابھرتے ہیں جن میں خوف، بغاوت، بزدلی، عدم تحفظ اور بیزاری کا غلبہ ہوتا ہے۔ خوش نما زندگی تاریک نظر آتی ہے۔ آدمی پیدائش کے بعد سے بڑھاپے تک مسلسل جنگ لڑتا ہے اور ہر حال میں سرخرو ہونا چاہتا ہے لیکن جیت بڑھاپے کی ہوتی ہے۔ ہر آنکھ دیکھتی ہے کہ بڑھاپے کے اوپر موت چھا جاتی ہے۔ حیات کی ابتدا کتنی ہی بہار آفریں ہو — بالآخر خزاں اس کا مقدر ہے۔ سکھ ہو، چین ہو، پریشانی ہو، لڑکپن ہو یا جوانی— ہر چیز فانی ہے۔ فنا جب سامنے آتی ہے تو زندگی معدوم ہو جاتی ہے۔ زندگی کے دکھ سکھ شمار کئے جائیں تو دکھوں کا ایک لامتناہی سلسلہ نظر آتا ہے۔ فی الحقیقت ایسا نہیں ہے۔ آدمی چاہے تو اسے خوف اور غم سے رخصت مل جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بڑے پیار سے فرمایا،

"اللہ کے دوستوں کو خوف اور غم نہیں ہوتا۔" (یونس: ۶۲)

مردانہ وار لڑ کر فتح یاب ہونے کی ایک ہی صورت ہے کہ آدمی جدوجہد اور کوشش کی حقیقت سے واقف ہو جائے۔ واقفیت یہ ہے کہ زندگی دراصل ایک روٹین ہے۔ ہم سانس لیتے ہیں لیکن یہ نہیں سوچتے کہ ہم سانس لے رہے ہیں۔ پلک جھپکتی رہتی ہے مگر خیال نہیں جاتا کہ پلک جھپک رہی ہے۔

فلشن زندگی کی اکائیوں کو یکجا کیا جائے تو شہادت فراہم ہوتی ہے کہ قانونِ فطرت میں جھول نہیں ہے۔ ہر چیز وقت کے ہاتھوں میں کھلونا ہے۔ وقت جس طرح چابی بھر دیتا ہے، شے حرکت کرتی ہے۔ وقت ہاتھ اٹھالے تو چابی ختم ہو جاتی ہے، کَل پرزے سب ہوتے ہیں مگر توانائی باقی نہیں رہتی۔

جب تک یقین میں یہ بات رہتی ہے کہ چیزوں کا موجود ہونا یا چیزوں کا عدم میں چلے جانا اللہ کی طرف سے ہے، اس وقت تک ذہنی مرکزیت اللہ تعالیٰ کے ساتھ قائم رہتی ہے۔ جب یقین ٹوٹ جاتا ہے تو آدمی ایسے عقیدے اور وسوسوں میں مبتلا ہو جاتا ہے جس کا نتیجہ انتشار، انتقام اور خوف و غم ہوتا ہے۔

مشورہ اپنی گزشتہ زندگی کا جائزہ لیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو وسائل کی فراوانی سے نوازا تھا۔ یقیناً کہیں کوتاہی ہوئی ہے۔ ناشکری ایسا فعل ہے جس سے برکت اٹھ جاتی ہے۔ اپنے، بیگم اور گھر کے افراد کے طرزِ عمل پر نگاہ ڈالیں، ہو سکتا ہے آپ سے یہ کوتاہی سرزد ہوئی ہو۔

محاسبہ کریں گے تو حقیقت کا انکشاف ہوگا کہ آدمی کے سکون کے سب سے بڑے دشمن غرور و تکبر ہیں جو عاجزی اور انکسار کو کھا جاتے ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ سے کسی کی حق تلفی نہ ہوئی ہو—؟ والدین کی خدمت نہ کرنا اور ان کو ان کا مقام نہ دینا بھی حق تلفی ہے۔ ہم مرغ کھاتے ہوں اور پڑوس میں چٹنی میسر نہ ہو، یہ بھی حق تلفی ہے۔ جس دھرتی پر ہم رہتے ہیں، ہم پر اس کے حقوق ہیں۔ آدمی جلد بازی میں ایسے فیصلے کرتا ہے جن سے لوگوں کی حق تلفی ہوتی ہے جب کہ اس مذموم عمل کا احساس نہیں ہوتا۔ آپ کا یہ لکھنا کہ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا، خود آپ کے لئے غور طلب ہے۔ اللہ کے لئے آپ نے کیا کیا ہے—؟ آپ کا ہی کہنا ہے کہ میں نے خیرات کی، لوگوں کی مدد کی۔ اس طرح نیکیوں کا برملا اظہار کس بات کی غمازی کرتا ہے—؟ اس کے بارے میں سوچنے اور فکر کرنے کی ضرورت ہے۔ اللہ نے آپ کو کیا کچھ نہیں دیا؟ دماغ، آنکھیں، ہاتھ، پیر، سونگھنے اور محسوس کرنے کی حسیات، مختصر یہ کہ زندگی اور زندگی میں جسمانی و ذہنی طور پر وسائل۔

میرے عزیز! اللہ تعالیٰ آپ کو پریشانی کے گرداب سے جلد نجات عطا کریں۔

آپ قانونِ قدرت کا مطالعہ ضرور کریں۔

کائنات زنجیر کی کڑیوں کی طرح ہے۔ کڑیاں الگ ہو جائیں تو کائناتی نظام ٹوٹ جائے گا۔ یہاں سب کچھ ہونا اس لئے ضروری ہے کہ جزا اور سزا کا قانون زندہ ہے۔ اولاد جس طرح ماں باپ کی جائیداد کی وارث ہے، اسی طرح خطاؤں کی پاداش میں مصیبتیں اور پریشانیاں اولاد کو ورثے میں منتقل ہوتی ہیں۔

جہاں تک بغاوت اور سرکشی کا تعلق ہے، آدمی ہمیشہ قوانینِ قدرت سے متصادم رہا ہے۔ بڑے بڑے نمرود اور شداد گزرے ہیں، جو بھی نظامِ قدرت سے ٹکرایا— وہ پاش پاش ہو گیا۔

آپ حوصلے سے کام لیں۔ اللہ نے آپ کو پہلے نوازا تھا، آئندہ بھی نوازے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ "میری رحمت سے مایوس نہ ہو"۔ ہمتِ مرداں، مددِ خدا۔ مردانہ وار آگے بڑھئے۔ جن کوتاہیوں کی نشاندہی کی گئی ہے، ان کو ایک کاغذ پر لکھ کر بار بار پڑھئے اور اللہ کا شکر ادا کیجئے۔ شکر ادا کرنے سے اللہ خوش ہوتا ہے اور وسائل میں اضافہ ہوتا ہے۔

دعاگو۔ عظیمی

امتحان کا نتیجہ

27 جنوری 2023ء کو ابدالِ حق حضور قلندر بابا اولیاءؒ کے عرس کے موقع پر محترم عظیمی صاحب نے ''صبغۃ اللہ — اللہ کا رنگ'' کے موضوع پر خطاب فرمایا۔ خطاب ''ماہنامہ قلندر شعور'' مارچ 2023ء کے شمارے میں شائع ہوا اور ایک امتحانی پرچہ ترتیب دیا گیا جس کے کل نمبر 50 تھے۔ پاکستان اور بیرونِ ملک سے سینکڑوں کی تعداد میں جوابی پرچے موصول ہوئے۔

- پہلی پوزیشن لاہور سے ڈاکٹر ثمینہ عامر (Ph.D. in Physics) نے 42 نمبر لے کر حاصل کی۔
- دوسری پوزیشن دبئی سے ماسٹرز آف سائیکالوجی کی طالبہ چیتالی پربھو کی ہے۔ ان کے نمبر 40 ہیں۔
- تیسری پوزیشن مسی ساگا، کینیڈا سے انجینئر سلمان سلطان اور متحدہ عرب امارات سے انجینئر عمران خان کی ہے۔ دونوں نے 39 نمبر حاصل کئے۔

مجموعی طور پر نتائج خوش آئند ہیں۔ الحمدللہ امتحان میں کوئی فیل نہیں ہوا۔ جوابات کی چیکنگ میں اس بات کو مدنظر رکھا گیا کہ پرچہ دی گئی ہدایات کی روشنی میں حل کیا گیا ہے یا نہیں۔

- حل شدہ امتحانی پرچوں میں سے منتخب حصے شائع کئے جارہے ہیں:

◈ چیتالی پربھو (دبئی): الوژن رنگ صراطِ مستقیم سے دوری ہے۔ زمین پر رنگوں میں تغیر دیکھنا جنت میں کی گئی نافرمانی کی یاددہانی ہے۔ رنگ تبدیل نہیں ہورہے، ہم متغیر ذہن سے دیکھ رہے ہیں۔ مثلاً بیج کے رنگ معین ہیں اور بیج میں موجود ہیں۔ محدود نگاہ سے بیج کو دیکھتے ہیں تو صرف بیرونی خول نظر آتا ہے، اندرونی خصوصیات اوجھل رہتی ہیں۔ جب بیج سے پودا اور پودے سے درخت بنتا ہے تو درخت کے ہر حصے کے رنگ الگ نظر آتے ہیں۔ دراصل بیج میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی، درخت اس کے اندر مطلق حالت میں موجود ہے۔ بیج کی مرحلہ وار نشوونما illusion ہے جو ٹائم اور اسپیس کے فرق کی وجہ

سے ہے۔ میرا اصل رنگ وہ ہے جس پر اللہ نے مجھے تخلیق کیا ہے مگر اِس وقت میں جس رنگ میں ہوں، وہ الوژن ہے۔ امتحان میں دیا گیا30 روز کا مراقبہ پابندی سے کیا۔ مراقبہ کے ابتدائی دنوں میں الحمدللہ زیارت سے مشرف ہوئی۔

◈ ڈاکٹر عائشہ سید (کینیڈا): محترم عظیمی صاحب نے عرس 2023ء کے موقع پر خطاب میں فرمایا تھا، ”اگر سفید رنگ ہے تو وہ سفید ہی ہے۔ سفید رنگ کو دیکھ کر آپ سرخ نہیں کہیں گے، نیلا پیلا نہیں کہیں گے۔“ اس سے واضح ہے کہ تغیر شے میں نہیں، دیکھنے والے کی نظر میں ہے۔ شعوری رفتار کی بنیاد پر مطلق شے چھوٹی بڑی، گھٹتی بڑھتی اور رنگ بدلتی نظر آتی ہے۔ ایک رنگ پر دوسرا رنگ کرنے سے پہلا رنگ چھپ جاتا ہے لیکن ختم نہیں ہوتا — اپنی جگہ موجود رہتا ہے۔ مراقبہ میں دیکھا کہ چھوٹا روشن چاند آس پاس گھوم رہا ہے، پھولوں کے نقوش بھی نظر آئے۔

◈ گلستان احمد (ٹیکسلا): جسم خلیات پر مشتمل ہے۔ خلیوں کے اندر chromosomes دراصل رنگوں کی مقداریں ہیں۔ ہر مقدار (رنگ) دوسری مقدار سے مختلف نظر آتی ہے لہٰذا رنگوں سے وجود میں آنے والے مادی جسم الگ الگ مقداروں کا مظاہرہ ہیں۔

◈ ڈاکٹر ثمینہ عامر (لاہور): پرندوں، درختوں، آدمی اور پتّوں کے رنگ صلاحیتوں (مقداروں) کو ظاہر کرتے ہیں۔ رنگ کی تبدیلی ماہیت (مقداروں) کی بنیاد پر ہے۔ مثلاً سبز رنگ گھاس میں پانی کی مقدار کم ہوتے ہی گھاس کا رنگ بدلنے (زرد پھر سیاہی مائل) لگتا ہے۔ بالآخر گھاس چورا چورا ہو کر بکھر جاتی ہے۔ مراقبہ میں کثرت سے ہلکی روشنی کے دائرے اپنی طرف آتے دیکھے۔ مساوات یہ بنی،

پانی(روشنی) کی بھرپور مقدار = سبز رنگ (ہری بھری گھاس)

پانی (روشنی) میں حرکت (مقداروں) کی کمی = زرد رنگ

پانی(روشنی) کا گھاس سے تعلق منقطع ہونا = گھاس کا ذرّات میں تبدیل ہو جانا

◈ ناصرہ خاتون (میانوالی): رنگوں میں تغیر نہیں، ہم تغیر دیکھ رہے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے کہ پہاڑ بادلوں کی طرح اڑ رہے ہیں مگر آدمی ان کو جما ہوا دیکھتا ہے۔ یعنی آدمی الوژن دیکھتا ہے۔

◈ عائشہ احمد (عجمان): حقیقی رنگ تبدیل نہیں ہوتا۔ واقفیت کے لئے ”فطرت“ سے رجوع کرنا ہوگا۔

◈ سلمان سلطان (کینیڈا): جنت فرماں برداری اور یقین کی فضا ہے۔ وہاں شے کے ظہور کے ارتقائی مراحل نہیں، جو چیز جیسی ہے، ویسی رہتی ہے۔ وہاں پھل خراب نہیں ہوتا یعنی رنگ نہیں بدلتا۔ جنت کے بارے میں ارشادِ باری ہے، "اس کے پھل دائمی ہیں اور اس کا سایہ لازوال۔" (الرعد: 35) مراقبہ میں دیکھا کہ ذہن بڑا ہو رہا ہے اور توانائی داخل ہو رہی ہے۔ کبھی روشنی کے جھماکے محسوس ہوئے۔ مشق کے نتیجے میں خوابوں کا ایک سلسلہ شروع ہوا۔ کئی بار روحانی بزرگ سے ملاقات ہوئی۔

◈ طاہر محمود (کراچی) : آدمی عالمِ ناسوت میں آتا ہے تو اس پر شک (نافرمانی) کا پرت غالب ہو جاتا ہے۔ اس پرت کو اسفل سافلین کہا گیا ہے۔ اس پرت کی وجہ سے آنکھوں پر ایسا لینس لگ گیا جو الوژن (رنگوں میں تغیر) دکھاتا ہے۔ نتیجے میں حقیقی رنگ سے دوری ہو جاتی ہے اور تغیر غالب آجاتا ہے۔

◈ وفا انصاری (بحرین): اللہ کا رنگ اختیار کرنے سے مراد کیئر آف اللہ طرزِ فکر ہے۔ رنگوں میں اختلاف مقداروں کی وجہ سے ہے۔ جب یقین میں بے یقینی کا رنگ غالب ہوا تو آدمی زمین پر آ گیا۔

◈ سعدیہ ناز (اسلام آباد): شعوری حواس سے ہم جو کچھ دیکھتے ہیں، اس میں ردّ و بدل نظر آتا ہے۔ جب شے کی بنیاد نگاہ سے چھپ جائے تو پھر جو نظر آتا ہے، وہ الوژن یا تغیر ہے۔

◈ یاسمین گل (فیصل آباد): جنت میں ابا آدمؑ پر یقین کی دنیا روشن تھی۔ وہ خوف و غم سے آزاد اور اصل رنگ کا مشاہدہ کرتے تھے۔ شجرِ ممنوعہ کے قریب جانے سے یقین شک میں بدل گیا جس نے خوف کو جنم دیا۔ جنت میں نور غالب اور رنگ مغلوب ہیں۔ زمین پر رنگ اصل سے دوری ہیں۔ جنت سے زمین پر آنے کا سفر یقین سے بے یقینی میں داخل ہونے کا سفر ہے۔

◈ نوید احمد (عجمان): جس مناسبت سے اللہ کے احکامات پر عمل ہوگا، صبغۃ اللہ سے روشناسی ہوگی۔

◈ سائرہ عمران (کراچی) : جنت میں نافرمانی کر کے جو خطا ہم نے کی، اس کی وجہ سے ہمارا اصل رنگ چھپ گیا اور الوژن غالب آ گیا۔ اس وقت ہمارا رنگ الوژن ہے۔

◈ صدف فراز (امریکا): ارشادِ باری ہے، "اور یہ جو بہت سی رنگ برنگی چیزیں اس نے تمہارے لئے زمین میں پیدا کی ہیں۔" (النحل: ۱۳)۔ آسمان، زمین، چاند، سورج، ستارے، سیارے، پھل، پھول اور ہمارا جسم رنگوں سے مزین ہے۔ ہر رنگ الگ الگ shades میں نظر آتا ہے۔ پودا کئی رنگوں کا مجموعہ ہے۔

جڑوں کا رنگ، تنے کا اندرونی بیرونی رنگ، شاخ، پتے، پھول، اس میں لگنے والے پھل، پھل کے اندر گودے کا رنگ، اندر باہر بیج کا رنگ، پولن ٹیوب کا رنگ۔ پھر موسموں کے تغیر سے رنگوں کا بدلنا جس سے رنگ میں اضافیت ظاہر ہوتی ہے۔ خلیہ، تمام عناصر اور گیسز، ہوا، الفاظ، تاثرات، جذبات، صحت اور بیماری سب رنگین ہیں اور یہ سارے رنگ پانی میں ہیں۔ الغرض یہاں کوئی شے بے رنگ نہیں۔

◈ فرزانہ بانو (کراچی): کائنات روشنیوں کا مجموعہ ہے۔ اطلاع روشنی کی صورت میں نزول کرتی ہے لیکن تغیر میں مبتلا آدمی کو روشنی کی بجائے رنگ نظر آتے ہیں۔

◈ محمد عمر (شہر کا نام نہیں لکھا): آدمی جنت اور زمین دونوں مقام پر وسائل کا محتاج ہے۔ جنت میں وسائل کے حصول میں یقین کا پیٹرن کام کرتا ہے جب کہ زمین پر شک میں مبتلا آدمی کے اندر بے یقینی کا پیٹرن غالب ہوتا ہے اس لئے وسائل میں تغیر نظر آتا ہے۔ مثلاً سیب کھانے کے لئے بیج بونا پڑتا ہے پھر سالوں بعد درخت بنتا ہے اور پھل لگتے ہیں۔ جنت میں خیال آتے ہی پھل حاضر ہو جاتا ہے۔

◈ مریم افتخار (راولپنڈی): رنگ کی تبدیلی مقداروں کی وجہ سے ہے۔ مقداریں روشنیوں پر قائم ہیں اور روشنیوں کی بنیاد اللہ تعالیٰ کا نور ہے۔ آدمی کی نظر نور سے ہٹی تو الوژن رنگ غالب ہو گئے۔

◈ بلقیس بانو (کراچی): اللہ کے رنگ سے مراد اللہ کی صفات ہیں۔ اللہ محبت کرتا ہے، درگزر کرتا ہے، مخلوق کی حفاظت اور رزق کا انتظام کرتا ہے۔ اللہ بے نیاز ہے۔ اللہ کا رنگ اختیار کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی مخلوق سے توقعات ختم کر کے اللہ کا نیاز مند بن جائے اور بلا غرض لوگوں کی خدمت کرے۔

◈ محمد محسن (لاہور): تغیر ہمارے اندر ہے جس کا عکس ہم سامنے موجود چیزوں میں دیکھتے ہیں۔

◈ محمد تنویر عالم (اسلام آباد): اللہ کی ذات پر یقین سے بندے کو توانائی حاصل ہوتی ہے۔ شک میں آدمی قید و بند کی زندگی گزارتا ہے جب کہ یقین کے حامل بندے کے لئے اسپیس سمٹ جاتی ہے۔

◈ محمد امین عابد (لاہور): جنت کا نظام یقین ہے۔ جنت کے مکینوں کے ذہن میں یہ بات ہے کہ اللہ رب ہے اور تمام ضروریات کا کفیل ہے۔ زمین پر آکر ہم کاروبار اور نوکری کو اپنا کفیل سمجھتے ہیں۔

◈ بی بی انورادھا (دبئی): اللہ کا رنگ اختیار کرنے سے مراد الوژن رنگوں کی نفی ہے۔ اس کا ایک طریقہ شکر گزاری ہے۔ شکر گزار بندہ اللہ کے رنگ میں رنگ جاتا ہے۔

⊙ آمنہ فہیم (آسٹریلیا): رنگ کے دو رخ ہیں۔ ایک میں الوژن ہے۔ دوسرا رنگ حقیقی ہے۔ الوژن رنگ اصل سے دوری ہے اور حقیقی رنگ صبغۃ اللہ ہے۔ مثال یہ ہے کہ ہر بچہ دینِ فطرت (اصل رنگ) پر پیدا ہوتا ہے مگر ماحول میں شک کی وجہ سے دینِ فطرت سے دور ہو جاتا ہے۔ اس دنیا میں میرا رنگ الوژن ہے کیوں کہ میں الوژن کو قبول کرکے یہاں آئی ہوں۔ مراقبہ میں نیلا رنگ کھلتے کھلتے بند ہو جاتا تھا۔ ایک دو مرتبہ ہلکے جھماکے ہوئے۔ 30 دنوں میں ذہن بہت پُرسکون رہا۔

⊙ علی ضیا (کراچی): گرگٹ خطرہ محسوس کرتا ہے تو ماحول کے مطابق رنگ تبدیل کرلیتا ہے۔ من وعن ہم بھی ماحول کے مطابق رنگ اختیار کرتے ہیں۔ غصے میں رنگ سرخ اور خوف میں سفید ہو جاتا ہے، خوشی میں چہرہ تمتماتا ہے، خون کی کمی سے زرد ہو جاتا ہے۔ چمک دار نیلے رنگ کا تصور پیشانی پر قائم رہا اور متعدد مرتبہ نظر آیا۔ کبھی رنگ سنہری اور سفید ہوا۔

⊙ ریحانہ یوسف (کراچی): رنگ دوری ہے۔ مراقبہ میں پیشانی کے مقام پر نیلا چمک دار دائرہ نظر آیا جس میں روشنیوں کا ہجوم تھا۔ حقیقی اور الوژن رنگ کے بارے میں شاعر نے کہا ہے،

من کے بہتک رنگ ہیں، چھن چھن بدلیں سوئے　　ایکے رنگ میں جو رہے ایسا برلا کوئے

⊙ کنوز شیخ (ابوظہبی): جب تک ٹائم اور اسپیس کی قید و بند میں رہیں گے، رنگوں میں تغیر نظر آئے گا۔

⊙ فرخ اکرم (فیصل آباد): تخلیق کا بنیادی مسالا ایک ہے، مقداریں الگ الگ ہیں۔ مراقبہ میں مختلف رنگوں کے علاوہ نیلا رنگ نمایاں رہا۔ خلیے سے ملتی جلتی شکلیں نظر آئیں جن کی بیرونی دیوار سفید اور اندر گراف کی طرح خانے تھے۔ وہ بھی سفید تھے۔ خیال آیا کہ کائنات اسی طرح خلیات سے بنی ہے۔

⊙ عمران خان (دبئی): اصل سے دوری کی بنا پر جب ایک ہی شے ٹکڑوں میں تقسیم نظر آئے تو اس مظاہرے کو رنگ کہتے ہیں۔ ہمیں وہی نظر آتا ہے جو ہماری فکر سے مماثل ہوتا ہے۔ مجنوں کو لیلیٰ اس لئے نظر آتی ہے کہ اس کی فکر کچھ اور دیکھنا نہیں چاہتی۔ رنگ کی تبدیلی کی بنیاد لہر کی مختلف مقداریں ہیں۔ قرآن کریم میں ہے، ”پاک اور بلند مرتبہ ہے وہ ذات جس نے ہر شے معین مقداروں سے تخلیق کی اور ان مقداروں کی ہدایت بخشی۔“ (الاعلیٰ: ۱۔۳)۔ ہر مقدار ایک رنگ ہے۔ رنگ کا جدا جدا ہونا لہروں کی فریکوئنسی کا الگ الگ ہونا ہے۔

زیرِ سرپرستی

اللہ کے دوست حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی

عظیمیہ روحانی لائبریری

برائے خواتین

روحانی علوم کے متلاشی خواتین و حضرات، راہِ سلوک کے مسافر اور ــــ روحانی سائنس میں دلچسپی رکھنے والے طالبات و طلبہ کے لئے عظیمی صاحب کی کُتب اور تصوف کی دیگر کتابیں مطالعہ کے لئے موجود ہیں۔

فری ممبر شپ
فری مطالعہ

مکان نمبر 65 بلاک A-2، پنجاب ہاؤسنگ سوسائٹی
نزد جوہر ٹاؤن، لاہور۔ فون نمبر: 042-35185142

ملک محمد ناصر

ڈھول کی تھاپ

صاحب! آپ نے تو مجھے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، ناصر کو 'س' سے پکارا پھر ناسُر بنا دیا۔ ناصر نام زمانے نے مجھے دیا ہے۔ بندہ بے اختیار ہے، اپنی نہیں، دوسروں کی زندگی گزارتا ہے۔

محلے میں رسمِ حنا تھی۔ ڈھول بج رہا تھا، میں دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ لڑکے بالے ڈھول کی تھاپ پر رقص کر رہے تھے۔ ڈھول کے دونوں طرف چمڑا منڈھا ہوا تھا۔ چوب پڑنے سے ڈھول کے اندر خلا میں گونج پیدا ہو رہی تھی،

دھن دھن دھنا دھن دھن

دھن دھن دھنا دھن دھن

میں ڈھول کی تھاپ اور رقص کرنے والوں کے قدموں میں مطابقت پر حیران تھا۔ آواز کی لہریں کان کے پردوں سے ٹکراتی ہیں اور دماغ میں پہنچ کر اعصاب میں تقسیم ہو جاتی ہیں۔ جب آواز کی فریکوئنسی، جسم کی فریکوئنسی کے برابر ہوتی ہے تو اس سے خون میں خاص ارتعاش پیدا ہوتا ہے اور آدمی جھومنے لگتا ہے — ڈھول کی تھاپ میں جیسے جیسے تیزی آتی ہے، رقص کرنے والوں کے کپکپاتے قدم تیز ہو جاتے ہیں۔

میری نظر ادھیڑ عمر شخص پر پڑی جو اس ہجوم میں شہادت کی انگلی بلند کئے وجد میں رقصاں تھا۔ لگتا تھا کہ اس کا تعلق لڑکے والوں سے ہے نہ لڑکی والوں سے، دونوں طرف سے بے نیاز کوئی اور ہی خوشی تھی جس میں وہ جھوم رہا تھا۔

ڈھولچی رکا تو لڑکوں کا شور بلند ہوا۔ یہ ایک طرح سے رقص کے اختتام کا اعلان تھا۔ اب قہقہے اور باتوں کی آوازیں تھیں۔ ادھیڑ عمر شخص اب بھی جھوم رہا تھا۔ ڈھول رک گیا ہے پھر یہ کس تھاپ پر رقصاں ہے—؟ میں آگے بڑھا اور ہاتھ پکڑ کر اسے گھر کی طرف لے آیا۔

اس نے خاموش نظروں سے مجھے دیکھا۔

اس سے پہلے کہ میں سوال کرتا، اس نے پوچھا، تم کیوں نہیں ناچے—؟ یہاں ایک فرد ایسا نہیں

جس نے رقص نہ کیا ہو۔ لگتا ہے تم نے ڈھول کی آواز نہیں سنی یا پھر تم سمجھے نہیں کہ ڈھول کی تھاپ کیا کہہ رہی تھی۔

اسے بتایا کہ میں آواز سن کر ہی باہر آیا ہوں۔

آواز سنی ہوتی تو تم بھی جھومتے، آواز کہاں سنی، تم بہرے ہو۔ ناصر نہیں، ناسُر ہو اس لئے تمہیں رقص کرنا نہیں آتا — جس سَر میں سودا نہیں، اس میں سُر کہاں ہو گا!

وہ جانے کے لئے پلٹا تو میں نے پکارا، صاحب! آپ نے تو مجھے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، ناصر کو س سے پکارا پھر ناسُر بنا دیا۔ یہ نام میں نے نہیں رکھا، زمانے نے مجھے دیا ہے۔ بندہ بے اختیار ہے، اپنی نہیں، دوسروں کی زندگی گزارتا ہے۔

وہ قریب آیا اور آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا، ٹکڑے ٹکڑے کہاں کیا بابا! میں تو تمہیں جوڑ رہا ہوں۔ تمہاری تاریں ٹوٹی ہوئی ہیں اس لئے ڈھول کے سُر تم تک نہیں پہنچے۔

فقیر کے الفاظ نے تیل اور نظروں نے آتش کا کام کیا۔ میرے اندر آگ بھڑک اٹھی اور آنکھیں آتش کدہ بن گئیں۔

فقیر نے کہا، ہر انسان کے اندر ایک دیوانہ، سودائی اور مجذوب ہوتا ہے۔ مجذوب دیوانہ ہوتا ہے، اس کے سَر میں سودا ہوتا ہے مگر ہر دیوانہ مجذوب نہیں ہوتا۔

میں نے پوچھا، میرا نام کیسے معلوم ہے؟

جس کے ٹوٹے تار جڑ جائیں، وہ خود کو پہچان کر سب کو جان لیتا ہے۔ آواز کی گونج اور گونج میں ارتعاش سب بتا دیتی ہے۔ یہ کہہ کر وہ رکا نہیں — بابا بلھا شاہؒ کے الفاظ گنگناتا ہوا چلا گیا۔

اک نقطے وچ گل مکدی اے

میں اسے دیکھتا رہ گیا۔

فقیر کہتا ہے کہ وہ مجھے توڑ نہیں رہا تھا، جوڑ رہا تھا کہ پہلے سے ٹوٹے ہوئے کو کیا توڑنا۔ یہاں سب آواز کے ارتعاش میں بندھے ہوئے ہیں۔ بندھن کو محسوس نہ کرنے والے کا ربط ارتعاش سے ٹوٹا ہوا ہے یا جڑا ہوا —؟

اک نقطے وچ گل مکدی اے

نقطہ کیا ہے —؟

ہم جس بندھن میں ہیں، وہ قریب سے نقطہ اور دور سے دائرہ نظر آتا ہے اور دوری کی وجہ سے دائرہ بھی چھپ جاتا ہے۔ فقیر کہہ گیا ہے کہ نقطے سے واقف ہو کر "آواز" سے جڑ جاؤ۔

کائنات کیا ہے —؟ ایک نقطے کا پھیلاؤ ہے۔

نقطہ غیب سے ظاہر ہوتا ہے تو پھیل جاتا ہے، کسی کو اس میں پانی نظر آتا ہے، کسی کو بادل، کسی کو پہاڑ، کسی کو زمین اور زمین میں رنگ رنگ تخلیقات — پھیلاؤ کی وجہ سے جس کی نظر جس مقام پر ٹھہرتی ہے، وہ اسے کوئی نام دے دیتا ہے۔ نقطہ سمٹتا ہے تو چیزیں غائب ہو جاتی ہیں۔ معلوم نہیں کہاں غائب ہو جاتی ہیں۔

دنیا بنتی ہے اور ٹوٹتی ہے، ٹوٹ کر پھر دنیا بن جاتی ہے۔ بیج ٹوٹنے سے سیب بنا، سیب ٹوٹ کر غائب ہوا اور اپنے پیچھے کئی سیب چھوڑ گیا۔ تمام بیج غیب ظاہر غیب کے مسافر ہیں اور وجد میں رقصاں ہو کر راستہ طے کرتے ہیں۔ غیب ظاہر غیب نقطہ ہے جس سے واقف ہونے والے کو کائناتی ارتعاش پر رقص کرنا آجاتا ہے۔

جھومنے کی حالت پر غور کریں تو دائرہ بنتا ہے۔ جس حالت سے جھومنے کی ابتدا ہوتی ہے، اسی حالت پر اختتام ہوتا ہے — جھومتے ہوئے جب فرد کا جسم طولانی حرکت میں داخل ہوتا ہے تو دائرہ اسے کھینچ لیتا ہے۔

طرزِ فکر ایک ہو تو اجنبی دوست بن جاتے ہیں۔ اندر میں اٹھنے والی لہریں انہیں بلاتی ہیں۔ ہمارے ایک دوست ہیں، یاسین صاحب۔ وہ پارچہ بافی (ٹیکسٹائل) کی صنعت سے وابستہ ہیں اور کپڑوں کے پیٹرن (نمونے) بنانے کے ماہر ہیں۔ میں اکثر ان کے یونٹ پر جاتا ہوں۔

ایک دن پوچھا، پیٹرن کیا ہے—؟

وہ بولے، پیٹرن اس سانچے یا ڈائی کو کہتے ہیں جو لباس کی تیاری اور خوب صورتی میں اہمیت رکھتا ہے۔ کسی لباس کے نمونے کے تمام حصوں کو ناپ کر گتّے کے سانچے بنائے جاتے ہیں۔ سانچے کے مطابق کپڑا کاٹ کر سلائی کی جاتی ہے اور لباس تیار ہو جاتا ہے۔ کچھ توقف کے بعد انہوں نے کہا، دیکھا جائے تو ہر پیٹرن ایک طرزِ فکر ہے اور ہر عمل طرزِ فکر کا پیٹرن ہے۔

میں سوچ رہا تھا کہ یاسین صاحب کپڑوں کے پیٹرن بناتے ہیں، کیا ان کو کبھی احساس ہوا کہ میرا جسم بھی لباس ہے اور اس لباس کے ذریعے میری پہچان خود ایک پیٹرن ہے؟

سوال پوچھنے پر وہ خاموش ہو گئے۔

تفکر سے ذہن ایک نقطہ پر یک سو ہوتا ہے تو وہ نقطہ رخِ روشن بن جاتا ہے۔ فقیر کے الفاظ نے ایک بار پھر دستک دی۔ وہ کہہ گیا تھا کہ میں

تمہیں توڑ نہیں رہا، جوڑ رہا ہوں۔

میں کب ٹوٹا اور تقسیم کب ہوا؟

زندگی نقطہ ہے جسے میں نے ہمیشہ تقسیم در تقسیم کر کے دیکھا۔ ہر دن کو ایک نام دیا، سوچا نہیں کہ دوسرے دن کے اندر پہلا دن چھپا ہوا ہے اور تیسرے دن کی بنیاد پہلے دو دن ہیں۔ ایک دن دوسرے دن میں داخل ہوتا ہے، دوسرا دن چھپ کر تیسرا دن بن جاتا ہے — تینوں دنوں میں ربط ہے جو ان کو ایک دوسرے میں داخل کرتا اور نکالتا ہے، ظاہر غیب کرتا ہے اور غیب ظاہر کرتا ہے۔

میں نے وقت کو سیکنڈ، منٹ اور گھنٹے میں تقسیم کیا یہ سمجھے بغیر کہ جس وقت کو تقسیم کر رہا ہوں، وہ زندگی ہے۔ زندگی بھی کبھی تقسیم ہوتی ہے —؟ یہ تو یکجائی سے بنی ہے۔

جسم سوتا ہے تو سمجھتا ہوں کہ میں سو گیا۔ سونے کے بعد نیند کے پردے میں جاگنے والا بھی میں ہوں۔ طرزِ نگاہ کی وجہ سے میں نیند میں بھی وقت کو ٹکڑوں میں دیکھتا ہوں اور جاگنے کے بعد ان کو جوڑنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کوشش میں وہ ربط نظر انداز کر دیتا ہوں جس کی وجہ سے ہر دو اشیا کے درمیان تعلق قائم ہے۔ نتیجے میں نیند کی دنیا اور بیداری دونوں بے خبری میں گزرتی ہیں۔ خواب اور بیداری میں کوئی تو ربط ہے جس کی بنا پر میں جاگنے کے بعد سلسلہ وہیں سے شروع کرتا ہوں جہاں سونے سے پہلے چھوڑا تھا۔ ایسا نہ ہو تو نیند سے جاگنے کے بعد میں اپنی پہچان بھول جاؤں گا۔

میرے ایک دوست اور ہیں جن کا نام ظہیر ہے۔ وہ قریب بیٹھے قرآن کریم پڑھ رہے تھے۔ انہوں نے عینک ناک پر ٹکاتے ہوئے کہا، قرآن کریم کی بعض سورتوں کی ابتدا خاص حروف سے ہوئی ہے جن کو حروفِ مقطعات کہتے ہیں جیسے الٓمٓ، حٰمٓ، قٓ، نٓ۔ عام لوگوں پر ان الفاظ کے معانی نہیں کھلتے لیکن جستجو سب کو ہے کہ ان کی حقیقت کیا ہے۔

میں نے کہا، اور کچھ نہیں بس اتنا جانتا ہوں کہ یہ راز ہیں اور راز نقطے کی طرح ہوتا ہے جس کی صورت نظر آتی ہے مگر معلوم نہیں ہوتا کہ اس کے اندر کیا ہے۔

ظہیر صاحب کی بات کا جواب دینے کے بعد میں نے حروفِ مقطعات کے بارے میں سوچا۔ ایک آواز ذہن میں گونجی — کسی نے پوچھا، بیج

دیکھا ہے—؟ اس کے اندر درخت چھپا ہے۔ بیج کھلتا ہے تو نسل در نسل سفر کرتا ہے۔ چاہو تو اس سفر کو بیج کے اندر دیکھ لو اور چاہو تو بیج کے کھلنے اور پھیلنے کا انتظار کرو۔

سلیکان کا دور ہے۔ محقق نے اس پر تصرف کرکے اسپیس کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ چھوٹی چپ کے ذریعے موبائل فون ٹاور سے منسلک ہو جاتا ہے جہاں قریب دور سے آنے والے برقی اشارے (signals) جمع ہوتے ہیں یعنی ٹاور بھی ایک طرح سے نقطہ ہے۔

موبائل فون کی اسکرین مختلف pixels* سے بنی ہے جس کی بنیاد پر تصویریں اور ایپلی کیشنز ہاتھ کی حرارت سے پھیلتی اور سکڑتی ہیں۔ پکسلز نقطے ہیں اور ہاتھ کی حرکت طرز فکر ہے۔ دماغ بھی اسکرین ہے جس میں خلیات پکسلز کا کام انجام دیتے ہیں۔

عجیب بات ہے کہ زندگی اور موت ایک ہی بیلٹ پر رواں دواں ہیں۔ آدمی زندگی کے پھیلنے یعنی تقسیم در تقسیم ہونے سے خوش ہوتا ہے اور اس کے سمٹنے یعنی نقطے میں بند ہونے کو موت کہتا ہے۔ اسے موت کے اُس پار زندگی کا ادراک نہیں اس لئے وہ مرنے سے ڈرتا ہے

محسنِ انسانیت خاتم النبیینؐ کا ارشادِ گرامی ہے،

"مرجاؤ مرنے سے پہلے۔"

(آدمی اِس دنیا میں رہتے ہوئے اُس دنیا کا ادراک کرلے جہاں اسے جانا ہے۔)

فقیر جا چکا تھا لیکن اس کی باتیں، لوگوں کا رقص اور ڈھول کی تھاپ ذہن میں گونج رہی تھیں۔ جانے والے اپنی آواز کی لہریں فضا میں چھوڑ گئے تھے جن کو محسوس کرکے میں اندر ہی اندر جھوم رہا تھا۔ فقیر نے ڈھول کی جس تھاپ سے میرا ربط ٹوٹنے کی بات کی تھی، بالآخر میں اس سے جڑ گیا تھا اور آوازوں کو اندر میں دیکھ اور سن رہا تھا۔

---

* Pixel کا اردو ترجمہ عکصر ہے۔ یہ عکس اور عنصر کا مرکب ہے اور انہی الفاظ سے ماخوذ ہے۔ عکس سے عک اور عنصر سے صر۔ اس سے مراد کسی عکس یا گراف کا ایک نقطہ ہے۔ انگریزی میں بھی اس کا ماخوذی عمل اردو کی طرح ہے۔ 1965ء میں picture سے pix اور element سے el لے کر لفظ pixel بنایا گیا۔ ابتدا میں اس کا استعمال ٹیلی ویژن کی تصویر (عکس) کے چھوٹے چھوٹے نقاط یا عناصر کے لئے کیا گیا تھا۔

علمِ حقیقت

پیرانِ پیر دستگیر شیخ عبد القادر جیلانیؒ فرماتے ہیں،

ہم پر دو قسم کا علم نازل کیا گیا ہے۔ علمِ ظاہری اور علمِ باطنی یعنی علمِ شریعت اور علمِ طریقت۔ شریعت کا حکم ہمارے ظاہر پر اور طریقت کا امر ہمارے باطن پر ہے۔ دونوں علم جمع ہو جائیں تو ان کا نتیجہ علمِ حقیقت ہے جس طرح درخت اور پتّوں کے اجتماع کا ماحصل پھل ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے،

"اس نے دو سمندر بہائے کہ دیکھنے میں ملے ہوئے معلوم ہوتے ہیں لیکن ان کے مابین حدِ فاصل ہے کہ ایک دوسرے پر بڑھ نہیں سکتا۔" (الرحمٰن : ۱۹۔۲۰)

محض علمِ ظاہری سے حقیقت حاصل نہیں ہوسکتی اور نہ ہی منزلِ مقصود پر پہنچ سکتے ہیں۔ کامل عبادت کے لئے دونوں علوم ضروری ہیں، ایک علم کافی نہیں۔ جیسا کہ فرمانِ الٰہی ہے،

"میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں یعنی میری معرفت حاصل کریں۔"

پس جو اس ذاتِ باری کو پہچانتا ہی نہیں، وہ کس طرح اس کی عبادت کر سکتا ہے؟

معرفت — صفائی قلب اور دل کے آئینہ سے نفس کا حجاب دور کرنے سے حاصل ہوسکتی ہے۔ پھر اس میں جمالِ کنزِ مخفی (پوشیدہ خزانۂ انوارِ الٰہی) کا دل کی گہرائی کے سِرّ (مقامِ راز) کے اندر مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں،

"میں ایک مخفی خزانہ تھا۔ میں نے چاہا کہ میں پہچانا جاؤں۔ پس میں نے مخلوق کو محبت سے پیدا کیا کہ وہ میری معرفت حاصل کرے۔"

لہٰذا یہ بات واضح ہو گئی کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی معرفت (پہچان) کے لئے پیدا کیا ہے۔

(کتاب: سِرّ الاسرار)

حامد ابراہیم

فلاخن

تین دفعہ پڑھنے سے مضمون میں مخفی صلاحیتیں ظاہر ہوں گی، انشاءاللہ۔

- لیزر ٹیکنالوجی کے استعمال سے لوہے (حدید) کو ہاتھوں میں نرم کرنا اور اس سے زرہ بکتر، زنجیریں، اوزار اور ہتھیار بنانا۔
- قوی ہیکل جالوت کو فلاخن سے ختم کرنا۔
- خوش الحانی سے اللہ کی تسبیح بیان کرنا۔
- پہاڑوں اور پرندوں کا ذکر میں شریک ہونا۔

خالقِ کائنات اللہ کا ارشاد ہے،

"اور بلاشبہ ہم نے داؤدؑ کو اپنی طرف سے بڑا فضل عطا کیا۔ اے پہاڑو! اس کے ساتھ ہم آہنگی کرو اور پرندو! تم بھی۔ اور ہم نے لوہے کو اس کے لئے نرم کر دیا۔" (سبا : ۱۰)

پہاڑوں کا مادی وجود پتھر سے بنتا ہے۔ پتھر کی بنیاد مٹی ہے۔ لوہا اور تمام دھاتیں مٹی کی صورتیں ہیں — اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤدؑ کو جمادات میں تصرف کی صلاحیت عطا فرمائی۔

الہامی کتب تورات و انجیل میں حضرت داؤدؑ سے منسوب ایک ہتھیار کا ذکر ہے جس سے انہوں نے جالوت کو ہلاک کیا۔ وہ ہتھیار کیا تھا، اس حوالے سے کتاب "خاتم النبیین محمد رسول اللہؐ، جلد سوم" میں سے کچھ حصہ اختصار کے ساتھ پیشِ خدمت ہے۔

"حضرت داؤدؑ فلاخن (سنگ ریزوں سے بھری ہوئی تھیلیاں پھینکنے کا ہتھیار) چلانے میں ماہر تھے۔ فلاخن اتنی طاقت سے پھینکتے کہ جس چیز پر گرتا تھا، ریزہ ریزہ ہو جاتی تھی۔ ایک روز وہ جنگل سے گزر رہے تھے کہ راستے میں پتھر نے متوجہ کیا، 'میں حجرِ موسیٰؑ ہوں، مجھے اٹھا لیجئے، میں وہی پتھر ہوں جس سے حضرت موسیٰؑ نے فلاں دشمن کو ہلاک کیا تھا۔' پتھر اٹھا کر تھیلے میں رکھ لیا۔ کچھ فاصلے پر ایک اور پتھر بولا، 'میں حجرِ ہارونؑ ہوں۔' اسے بھی رکھ

لیا۔ تھوڑی دور ایک پتھر اور ملا جس نے کہا، 'میں حجرِ داؤدؑ ہوں، داؤدؑ اللہ کے نبی ہیں جو میرے ذریعے جالوت کو ماریں گے۔' انہوں نے یہ پتھر بھی اٹھالیا۔ تینوں پتھر تھیلے میں جاکر ایک ہوگئے۔ جب میدانِ جنگ میں حضرت داؤدؑ، دیو ہیکل جالوت کے مقابلے کے لئے اترے تو ایک ہاتھ میں لاٹھی، دوسرے ہاتھ میں فلاخن اور کندھے پر سنگ ریزوں سے بھرا تھیلا تھا۔ جالوت تمسخر سے بولا، کیا تم مجھے کتّا سمجھ کر بھگانے آئے ہو؟ حضرت داؤدؑ نے پتھر فلاخن میں رکھ کر جالوت کی طرف پھینکا۔ پتھر ماتھے کی ہڈی توڑ کر کھوپڑی میں گھس گیا۔ جنگ میں جالوت کی فوج کو شکست ہوئی۔"

فلاخن جسے اردو میں گوپھن بھی کہتے ہیں، ہتھیاروں میں سادہ ترین، وزن نہ ہونے کے برابر اور پتھر کے زمانے سے زیرِ استعمال ہے۔ حضرت داؤدؑ کے واقعے کے بعد یہ مقبول ترین ہتھیار بن گیا۔ آج بھی مختلف علاقوں میں اس کی نشانہ بازی کے مقابلے ہوتے ہیں۔ فلاخن میں ایسی کیا خوبیاں ہیں کہ سادہ رسیوں سے بنا یہ ہتھیار مہلک بن جاتا ہے—؟ آیئے سائنسی بنیادوں پر سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

بناوٹ: چھ فٹ لمبی رسّی کو درمیان سے کاٹیں تو تین تین فٹ کے دو ٹکڑے ہوتے ہیں۔ ان ٹکڑوں کے درمیان تین سے پانچ انچ کا چمڑا یا مضبوط کپڑے کا ٹکڑا دونوں طرف سے باندھ یا سی دیا جاتا ہے۔ چمڑے کے آزاد سرے کو خم دے کر چھلّے (loop) کی شکل دی جاتی ہے جس میں سے دو انگلیاں گزر سکتی ہیں۔ دوسرے آزاد سرے کے قریب گرہ لگائی جاتی ہے۔ اس کے آگے ایک یا ڈیڑھ انچ کا ٹکڑا چھوڑا جاتا ہے جس کو نوک دار بناکر جب فلاخن کو چلاتے ہیں تو ہلکے دھماکے یا پٹاخے جیسی آواز پیدا ہوتی ہے۔

پنجاب (پاکستان) کے دیہات میں باجرہ، جوار یا وہ فصلیں جن پر پرندے حملہ آور ہوتے ہیں، کسان فلاخن کے ذریعے ان کو اڑا دیتے ہیں۔

فلاخن چلاتے ہوئے آواز ختم کرنے کے لئے گرہ سے آگے رسّی کا تھوڑا حصہ کھول کر دھاگے الگ الگ کئے جاتے ہیں، یوں فلاخن خاموشی سے چلتا ہے۔ چمڑے کی چوڑائی تقریباً دو انچ رکھی جاتی ہے۔ اس میں ایک آدھ انچ خلا پیدا کیا جاتا ہے تاکہ پتھر سے مَس ہونے کا فاصلہ زیادہ سے زیادہ رہے ورنہ توانائی کا ایک مفید حصہ رگڑ کی وجہ سے ضائع ہوجاتا ہے۔

بہترین ساخت کا فلاخن وہ ہے جس میں رسّی کو اس طرح بُنا جائے کہ دونوں بازوؤں کی تین فٹ کی بُنائی مکمل ہونے پر ریشوں کو آگے دو میں برابر تقسیم کرکے تین سے پانچ انچ تک الگ الگ بُنا جائے۔ پھر پہلے کی طرح اگلا بازو اکٹھا کرکے بُن دیا جائے۔ شکل الف دیکھئے۔

بہترین ساخت کا فلاخن چلانے کے لئے زیادہ مہارت کی ضرورت ہے۔ رسّی جتنی لچک دار، مضبوط اور ہلکی ہوگی، فلاخن کی کارکردگی اور رفتار بڑھ جائے گی۔ شکل نمبرا اور ۲ دیکھئے۔

طرزِ عمل: فلاخن چلانے کے لئے انگوٹھے اور انگشتِ شہادت سے گرہ لگے حصے کو پکڑا جاتا ہے پھر انگلیاں چھلّے دار حصے سے گزار کر گرفت مضبوط کی جاتی ہے۔ درمیانی حصے میں پتھر یا ڈھیلا رکھ کر دونوں ہاتھوں سے فلاخن کو کھینچتے ہیں، گرہ والے اور چھلّے دار حصّے کو سر کے اوپر کی طرف رکھتے ہیں اور جس حصے پر پتھر ہے، اسے سامنے کی طرف قدرے نیچے رکھا جاتا ہے۔

شکل نمبر۳ کے مطابق آہستہ سے پتھر والے حصے کو آزاد کرکے دوسرے سرے سے رفتار بڑھاتے ہوئے اسے گھمایا جاتا ہے۔ گھمانے کی رفتار جتنی زیادہ ہوگی — پتھر میں اسی اعتبار سے توانائی ذخیرہ ہوگی۔ شکل نمبر چار دیکھئے۔

پتھر کے وزن، اس کی محوری حرکت اور رفتار کی ضرب سے دائروی قوت پیدا ہوتی ہے جسے دائروی حرکت کا معیارِ اثر[۱] کہا جاتا ہے۔ گھمانے کے دوران نشانے کے رخ پر پتھر کا حصہ آتے ہی دوسری جانب سے گرہ دار حصّے کو چھوڑ دیا جاتا ہے جس سے پتھر کا معیارِ اثر[۲]، دائروی سے مستقیم معیارِ اثر[۳] میں تبدیل ہو جاتا ہے اور پتھر پوری قوت سے نشانے پر لگتا ہے۔

طبیعیات پر مبنی دلچسپ حقائق اور تجزیہ:

کندھے سے ہاتھ تک پھر ہاتھ سے پتھر رکھے ہوئے آخری حصے تک لمبائی کو معیارِ اثر کا بازو کہا جاتا ہے۔ لمبائی ممکنہ حد تک بڑھانے اور پتھر پھینکنے کے لئے جھٹکا دینے کی قوت بھی پتھر کی رفتار اور معیارِ اثر کی قوت کو بڑھا دیتی ہے۔

جدید آلات سے فلاخن سے نکلنے والے پتھروں کی رفتار اور ان کو منتقل شدہ قوت کی پیائش کی گئی تو نتائج حیران کن تھے۔ تجربات سے اندازہ لگایا گیا کہ ایک ماہر فلاخن انداز کے چلائے گئے

۱۔ Angular Momentum ۲۔ Momentum ۳۔ Linear Momentum

اوسط یعنی مرغی کے انڈے کے برابر پتھر سے نشانے پر پہنچنے والی توانائی، عام رائفل کی گولی کی توانائی کے تقریباً برابر ہے۔ آپ سوچیں گے کہ رائفل کی گولی کی رفتار (ولاسٹی) زیادہ ہوتی ہے۔

طبیعیات کے اصول کے مطابق متحرک مادی شے کی رفتار کے ساتھ اس کی کمیت (ماس) یعنی مادے کی مقدار یکساں اہم ہوتی ہے۔ رفتار اور کمیت یک جان ہو کر تیسری قوت پیدا کرتے ہیں جسے معیارِ اثر کہا جاتا ہے۔ معیارِ اثر وہ قوت ہے جو نشانے پر منتقل ہوتی ہے۔ فلاخن کے پتھر کی رفتار رائفل کی گولی سے کم ہے لیکن زیادہ کمیت کی وجہ سے اس کا معیارِ اثر، رائفل کی گولی کے برابر ہو جاتا ہے۔ پتھر جتنا وزنی ہو گا، معیارِ اثر کی قوت اور توانائی کی مقدار غیر معمولی ہو گی۔

آثارِ قدیمہ سے ملنے والے فلاخن میں سیسے کی دھاتی گولیاں بڑی تعداد میں دریافت ہوئی ہیں۔ سیسہ لوہے یا تانبے کی نسبت بہت کثیف یعنی وزنی دھات ہے اس لئے فلاخن میں یہ عام پتھروں کی نسبت زیادہ فاصلے تک جاتا ہے اور زیادہ توانائی منتقل کرتا ہے۔

حضرت داؤدؑ کے واقعے میں روحانی پہلو کے ساتھ ساتھ رائج علوم کے اعتبار سے اس واقعے کا تجزیہ حیرت انگیز نتائج ظاہر کرتا ہے۔ تھیلے میں جاتے ہی تین پتھر ایک ہو گئے۔ یہ توجہ طلب نکتہ ہے۔ تین پتھروں کی کمیت یعنی مادے کی مقدار ایک پتھر کے سائز میں منتقل ہو گئی لیکن حجم (سائز) تین گنا نہیں بڑھا۔ وہ کیسے ــــ؟

اوسط سائز سے تین گنا بڑا پتھر فلاخن چلانے کے لئے بے کار ہے۔ اس سے ہوا کی رگڑ اور مزاحمت کم از کم تین گنا بڑھ جاتی ہے اور زیادہ توانائی ضائع ہوتی ہے۔ فلاخن کے لئے بہترین پتھر وہ ہے جو کم سائز میں زیادہ وزن یا کثافت رکھتا ہو ــــ ایسے پتھر میں تین گنا زیادہ کثافت کارکردگی کو تین گنا بڑھا دیتی ہے۔

حضرت داؤدؑ کے ہاتھ میں فلاخن اس وقت میدانِ جنگ میں سب سے خطرناک ہتھیار تھا۔ وہ بے مثال جسمانی قوت کے مالک تھے لہٰذا اس واقعے کو مادی لحاظ سے بھی دیکھا جائے تو ان کے ہاتھ سے چلائے گئے فلاخن سے نکلنے والے پتھر کی رفتار اور ایک پتھر کے سائز میں تین پتھروں کی قوت جمع ہونے سے معیارِ اثر کی قوت بڑھنے کا امکان کم از کم تین گنا زیادہ ہے۔ بہت ممکن ہے کہ ایسے تاریخی معرکے میں فلاخن کی رفتار

قدیم دور میں فلاخن کے استعمال کی منظر نگاری

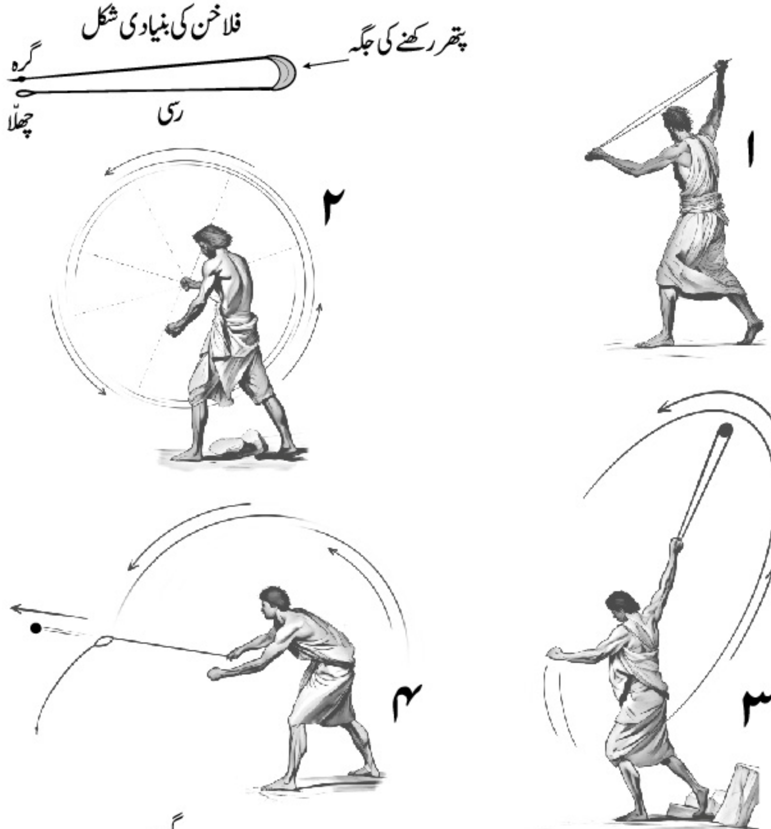

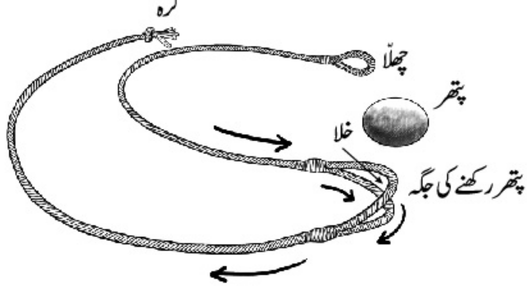

رسی کو فلاخن کی صورت بن دیا گیا ہے یعنی
اس میں کوئی جوڑ یا پیوند موجود نہیں ہے

مضمون میں مخفی قوانین کی مزید وضاحت کے لئے صفحہ نمبر 50 دیکھئے۔

عام حالات سے زیادہ اور نتائج اسی مناسبت سے غیر معمولی ہو سکتے ہیں۔

محققین کے مطابق ماہر فلاخن انداز کے چلائے گئے سو سے تین سو گرام پتھر کی رفتار سو میل فی گھنٹہ (160 کلو میٹر فی گھنٹہ) ہے۔ اگر اوسط وزن دو سو گرام لیں تو معیارِ اثر کی مساوات یہ ہے،

P = m x v

معیارِ اثر = کمیت x رفتار

(160km/h = 44.4m/s)

(200g = 0.2kg)

8.89kg m/s = 44.4m/s x 0.2kg

سائز وہی رہے لیکن مادے کی مقدار (کمیت) تین گنا بڑھا دی جائے یعنی چھ سو گرام تو معیارِ اثر کی مقدار 26.7 kg m/s ہو جاتی ہے۔ کمیت بڑھنے سے رفتار بڑھنا یقینی ہے کیوں کہ حجم (سائز) وہی ہے۔ رفتار کو 160 کلو میٹر فی گھنٹہ سے بڑھا کر 200 کلو میٹر فی گھنٹہ کیا جائے تو معیارِ اثر کی مقدار 33.33 kg m/s یونٹ تک پہنچ جاتی ہے۔ یہ امر یقینی ہے کہ حضرت داؤدؑ کے فلاخن سے نکلے ہوئے پتھر کا معیارِ اثر اس سے کہیں زیادہ ہو گا۔ مضمون میں سمجھانے کے لئے احتیاطاً مقداریں کم رکھی گئی ہیں۔ اس کے باوجود ہم دیکھ سکتے ہیں کہ معیارِ اثر کی یہ مقدار انتہائی غیر معمولی ہے۔

آج رائفل سے داغی گئی گولی کا اوسط معیارِ اثر 4.5 kg m/s ہے۔ اس طرح 33.3kg m/s اس کا تقریباً سات گنا بنتا ہے۔ لہٰذا یہ سمجھنا آسان ہے کہ اتنا زیادہ معیارِ اثر رکھنے والا پتھر جالوت کی پیتل سے بنی زرہ بکتر یا سر پر پہنے خَود کو پھاڑ کر کھوپڑی میں کیسے گھس گیا۔

فلاخن چلاتے ہوئے رفتار تیز ہو تو دھماکے کی آواز کیوں پیدا ہوتی ہے—؟ کئی بار قوت سے گھمانے سے دائروی حرکت تیز ہوتی جاتی ہے۔ اچانک رسّی چھوڑنے پر رسّی کے ایک سرے کی رفتار آواز کی رفتار کی حد سے تجاوز کر جاتی ہے۔ ایسے میں ہوا کا تھپیڑا دھماکے کی آواز پیدا کرتا ہے جسے محققین Sonic Boom کہتے ہیں۔

سادہ رسّی میں اس طرح کے عجائبات مخفی ہونا دلچسپ اور تفکر طلب ہے۔

بین الاقوامی اکائیوں کے نظام (SI ۔ سسٹم انٹرنیشنل) کے مطابق کلو میٹر فی گھنٹہ (km/h) کو میٹر فی سیکنڈ (m/s) اور گرام (g) کو کلو گرام (kg) میں تبدیل کیا گیا ہے۔

The Secret of a Beautiful Smile

DENTAL innovations Clinic

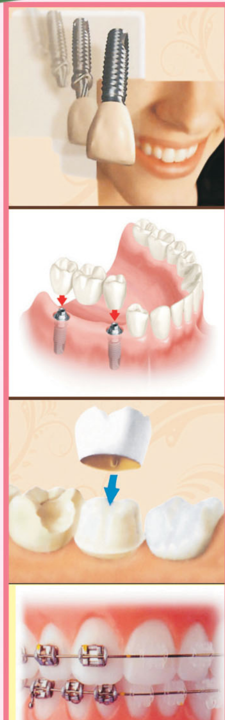

Dental Implants

Aesthetic Dentistry

Teeth Whitening, Porcelain Crowns, Veneers, Ceramic Restorations

Restorative Dentistry

Crown & Bridge, Root Canal Treatment

Orthodontics

Fixed And Removable Braces, Invisible Braces

General Dentistry

Extractions, Fillings, Dentures

Preventive Dentistry

Pit Fissure Sealants, Scaling, Root Planning

Minor Oral Surgery

Impaction (Wisdom Teeth), Apicectomy

Pediatric Dentistry

Space Maintainers, Steel Crowns

LAHORE

LG 136, Siddiq Trade Center
Main Boulevard Gulberg.
0301 2399991 - 042 2581711
0300 8511747

QUETTA

Balochistan Medical Center
Prince Road / Fatima Jinnah Road,
081 2836448 - 081 2825275
0300 3811747

FL 5 & 6, Block B, Gulshan-e-Jamal
Rashid Minhas Road, Karachi.

f: lavishdinerestaurant

Lavish Dine
Restaurant

www.lavishdinerestaurant.com

- Party up to 400 Persons
- Affordable Party Menus
- Buffet
- À la carte

Ph: 021-34570423
Cell: 0333-3538004

عابد محمود

عنوان ـــ قارئین بتائیں

گڈو مطمئن کیسے ہوتا ـــ؟ اس کے ذہن میں پانچ ہزار کی گونج جاری تھی۔ ایسے میں ہزار پانچ سو اس کی کیا تشفی کرتے ـــ؟

شہاب پورہ کی سڑک پر مرحبا ہوٹل کے سامنے فٹ پاتھ پر رکھی کرسیوں پر لوگ رات گئے بیٹھے رہتے۔ چائے پراٹھے کے دَور چلتے تھے اور محفل جمانے والے آس پاس موجود تکہ کباب کے ذائقوں سے بھی لطف اندوز ہوتے۔ اکثر رات کو ہم دوستوں کی یہاں بیٹھک ہوتی تھی۔

آج میں شہاب پورہ آیا تو وہ میز خالی تھی جس پر ہم دوست بیٹھتے تھے۔ تعجب ہوا کہ دوست اب تک کیوں نہیں آئے ـــ؟ سائیں کیتلی میں چائے کی پتّی ڈالتے ہوئے چھوٹے کو ہدایات دے رہا تھا۔ میری طرف دیکھا تو میں نے سلام کے انداز میں ہاتھ بلند کیا، اس نے اسی انداز میں جواب دیا اور کام میں مشغول ہو گیا۔ میں ہلکی آواز میں گنگنا کر انگلیوں سے میز بجاتے ہوئے ماحول کا جائزہ لینے لگا۔

کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا
کہیں زمیں تو کہیں آسماں نہیں ملتا

کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھ کر سڑک کے اس جانب نظر دوڑائی جہاں سے زاہد اور حماد کے آنے کا امکان تھا۔ ہم بچپن کے دوست تھے ۔ حماد کی ایک بڑے اسٹور میں ملازمت تھی۔ زاہد جرمنی میں سکونت اختیار کر چکا تھا اور آج کل اپنے جرمن دوست لارنس کے ساتھ پاکستان آیا ہوا تھا۔

چھوٹا میز کے قریب آیا تو میں نے پوچھا، کیا میرے دوستوں میں سے کوئی آیا تھا؟

آئے تھے باؤجی۔ وہ مختصر جواب دیتا تھا۔

میرے لئے کوئی پیغام دیا انہوں نے؟

باؤ زاہد کے ساتھ کوئی انگریز تھا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ کام نمٹا کر تھوڑی دیر میں آتے ہیں۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور چائے لانے کا کہا۔ چھوٹے نے دور سے سائیں کو آواز لگائی، استاد جی! ایک چائے باؤ عابد کے لئے۔ اور پھرتی سے دوسری میز کی طرف بڑھ گیا۔

نظریں اس راستے پر مرکوز تھیں جہاں سے دوست آتے تھے کہ مجھے فیقہ نظر آیا۔ وہ ٹین کے ڈبّے کو جسم سے گھسیٹتے ہوئے سڑک پر رینگ رہا تھا۔ جب میں نے اسے پہلی مرتبہ دیکھا تھا تو دل دہل گیا تھا۔ ہاتھوں اور نچلے دھڑ کے بغیر وہ گوشت کا بڑا ٹکڑا لگتا تھا۔ کمر پر چمڑے کی بیلٹ اس کو گرم سڑک کی حدت سے محفوظ رکھتی تھی۔ اپنے صحیح سالم وجود پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے جیب سے بڑا نوٹ نکال کر اس کے ٹین کے ڈبّے میں ڈال دیا تھا۔

جب میں یہاں آتا اور فیقے کی مجھ پر نظر پڑتی، وہ میری طرف آجاتا۔ آج بھی اس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ اپنی طرف آتا دیکھ کر میں نے استغفار پڑھنا شروع کیا اور سو روپے کا نوٹ ڈبّے میں ڈالا۔ وہ ڈبّہ گھسیٹتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اتنے میں چھوٹے نے چائے کا کپ میز پر رکھا۔ چائے کی بھاپ اور تیز خوش بو بہت بھلی لگی۔ پہلا گھونٹ لیتے ہی سائیں کی طرف دیکھ کر اشارے سے کہا، لاجواب! اللہ نے اس کے ہاتھ میں نہ جانے کیسا ذائقہ رکھا تھا کہ دور دور سے لوگ چائے پینے آتے تھے۔ چائے ختم ہوتے ہی زاہد اور حماد آگئے۔ جرمن مہمان لارنس ان کے ہمراہ تھا۔ لوگ کام چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہوگئے۔ سب کی نظریں خود پر محسوس کرکے وہ ہاتھ کے اشارے سے سلام کرکے کرسی پر بیٹھ گیا۔

سلام دعا اور تعارف کے بعد زاہد نے بتایا کہ لارنس جسمانی طور پر معذور لوگوں کے لئے کام کرنا چاہتا ہے۔ اسے چیمہ صاحب سے ملوانے لے گئے تھے جو معذور افراد کے لئے کام کرتے ہیں۔ ملاقات کافی اچھی رہی۔

معذور افراد کا سن کر میں نے فیقے کی طرف اشارہ کیا۔ زاہد نے کہا، ہاں! لارنس کو اس سے ملوایا جاسکتا ہے۔ جرمن زبان میں لارنس سے کچھ کہا پھر ہم سے مخاطب ہوا، آؤ! اس کو فیقے سے ملواتے ہیں۔ ہم اس کے پیچھے چل دیئے۔

فیقہ فٹ پاتھ پر پڑا تھا۔ اسے دیکھ کر لارنس کے چہرے پر پریشانی اور ہمدردی کے تاثرات ظاہر ہوئے۔ راہ گیروں نے فیقے کے پاس ایک

غیر ملکی کو کھڑے دیکھا تو کچھ قریب آئے اور کچھ رک کر دور سے جائزہ لینے لگے۔ لارنس نے زاہد کے ذریعے فیقے سے کچھ سوالات کئے جن کے اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیئے۔ میں نے نوٹ کیا کہ اسے کوئی بیماری تھی جس کی وجہ سے چہرے پر زخم بن گیا تھا۔

میں زیادہ دیر کھڑا نہ رہ سکا اور ہجوم کو چیر کر نکلا تو سڑک کی دوسری طرف گڈّو نظر آیا۔

اس نے پوچھا، وہاں کیا ہو رہا ہے؟

میں کچھ کہے بغیر چائے والے کی طرف آ گیا۔

اندر میں سوالات تھے جن کا جواب مجھ جیسے لوگوں کے پاس نہیں تھا۔

فیقہ ایسا کیوں ہے—؟

اس کے ہاتھ پیر کہاں گئے—؟

گڈّو کا ہاتھ بے کار کیوں ہے—؟

اس میں ان کا کیا قصور ہے— ؟

سوالوں کی تکرار سے گھبرا کر اِدھر اُدھر توجہ مبذول کرنے کی کوشش کی اور دوستوں کے واپس آنے کا انتظار کرنے لگا۔

وہ واپس آئے تو حماد نے سرگوشی کے انداز میں کہا کہ لارنس نے فیقے کو پانچ ہزار کا نوٹ دیا ہے۔ اتنے میں چھوٹا سب کے لئے چائے لایا اور اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔

میں نے دیکھا کہ گڈّو ہماری طرف آ رہا ہے۔ اس کا ایک ہاتھ پتلا اور لٹکا رہتا تھا جسے دکھا کر وہ بھیک مانگتا تھا۔ میرے دل میں اس کے لئے کبھی ہمدردی پیدا نہیں ہوئی۔ وہ ایک ہاتھ سے معذور تھا لیکن فیقے کی طرح رینگتا نہیں تھا۔ لوگ اسے پانچ دس روپے ضرور دیتے جب کہ فیقے کو سو پچاس آرام سے مل جاتے تھے۔

گڈّو کو خبر ہو گئی تھی کہ فیقے کو پانچ ہزار روپے ملے ہیں۔ ایک ہاتھ سے اپنا لٹکا ہوا ہاتھ لارنس کے سامنے کر کے بھیک کا خاموش تقاضا کیا۔

اس نے جیب سے سو کا نوٹ نکالا۔

گڈّو نے مایوسی سے سرخ نوٹ دیکھا اور ایک ہاتھ آسمان کی طرف بلند کر کے دعا دی۔

لارنس نے اشارے سے چائے کا پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ زاہد نے چھوٹے کو کرسی لانے کا کہا اور چائے کا آرڈر دیا۔

لارنس نے اپنی زبان میں زاہد سے کچھ کہا۔

اس نے پرس سے پانچ سو کا نوٹ نکال کر گڈّو کے سامنے لہراتے ہوئے پوچھا، یہ تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہے۔ سچ کہو گے تو یہ نوٹ تمہارا۔

گڈّو نے بجھی ہوئی نگاہوں سے نوٹ دیکھ کر پوچھا، صاحب! کیا میری بس اتنی اوقات ہے؟

درد کی ایک لہر میرے جسم میں سے گزر گئی۔

زاہد نے پانچ سو کا ایک اور نوٹ نکالا اور اس کی جیب میں ڈالتے ہوئے پوچھا، اب ٹھیک ہے؟

گڈّو مطمئن کیسے ہوتا؟ اس کے ذہن میں پانچ ہزار کی گونج جاری تھی۔ ایسے میں ہزار پانچ سو اس کی کیا تشفی کرتے۔ افسردگی سے کہا، پوچھو صاحب! کیا پوچھنا ہے؟

زاہد بولا، یہ پوچھ رہا ہے کہ کیا تم پیدائشی معذور ہو یا کسی نے تم سے بھیک منگوانے کے لئے معذور کیا ہے؟

گڈّو ہنستے ہوئے بولا، آپ کوٹھیوں میں رہنے والے لوگ ہمارا درد نہیں سمجھتے۔ اماں بتاتی ہیں کہ جب میں چھ ماہ کا تھا تو بیماری نے آن گھیرا۔ جب سے ہوش سنبھالا ہے، خود کو جھولتے ہاتھ کے ساتھ دیکھا ہے۔

چھوٹے نے چائے کا کپ لاکر گڈّو کے آگے رکھا۔ وہ خاموشی سے چائے پینے لگا۔

روز کتنے پیسے کما لیتے ہو—؟

صاحب جی! ایک ہاتھ کا ٹُنڈا کیا کما سکتا ہے۔ بس گزر بسر ہو جاتی ہے۔

زاہد بولا، میرا دوست کہہ رہا ہے کہ تمہارے ہاتھ کا علاج کرواسکتا ہے۔ علاج مفت ہوگا اور معذوری سے نجات مل جائے گی۔

گڈّو نے حیرت سے لارنس کی طرف دیکھا پھر زاہد سے بولا، صاحب! کہانا کہ آپ غریبوں کی مجبوری کو نہیں سمجھتے۔

لارنس کو گڈّو کا جواب بتایا گیا تو اسے یقین نہیں آیا۔ میرے دوستوں کو بھی حیرت تھی کہ ایک غیر ملکی علاج کا خرچہ اٹھانے پر تیار ہے اور سمجھتا ہے کہ ایسی ٹیکنالوجی موجود ہے جو اس کی معذوری کو کسی حد تک ختم کر سکتی ہے پھر یہ علاج کروانے پر راضی کیوں نہیں؟

میں گڈّو کے جواب پر حیران نہیں تھا۔

گڈّو نے خاموشی توڑتے ہوئے حسرت سے کہا، باؤجی! ایک بات پوچھوں؟

زاہد نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

وہ رندھی آواز سے بولا، باؤجی! اپنے دوست کو بتاؤ کہ ایک معذور ہاتھ سے گزارہ نہیں ہوتا۔ کیا یہ انگریز مجھے فیقے جیسا بنا سکتے ہیں؟

گلِ نسرین

لباس کیا چاہتا ہے — ؟

"ایک خاندان مجھ سے ملنے آیا۔ ان کی دو بیٹیاں تھیں۔ میں نے بیٹیوں سے پوچھا کہ آپ کی الماری میں کتنے کپڑے ایسے ہیں جو ابھی تک نہیں پہنے؟ پہلی نے کہا، چالیس (40)۔ دوسری نے بتایا، 40سے کچھ کم۔ یہ ناشکری ہے۔ ایسے کپڑوں کو کیڑے لگ جاتے ہیں جو ناشکری کا نتیجہ ہے۔"

ابا آدمؑ اور اماں حواؑ زمین پر آئے تو بود و باش کے تمام وسائل یہاں پہلے سے موجود تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نوعِ آدم زمین کی طرزوں اور وسائل سے جس قدر واقف ہوئی، اسے ترقی کا نام دیا۔ یہ آدمی کے شعور کی ترقی ہے کہ اس نے وسائل کو کہاں تک دریافت کیا اور ان میں تصرف کرکے ایجادات کیں۔

زمین پر پہلا دور پتّوں اور لکڑی کا ہے جب آدمی نے درختوں پر رہائش اختیار کی، جسم پتّوں سے ڈھانپا اور دو درختوں کے درمیان لکڑی رکھ کر پل بنایا۔ یہ طرزیں آج بھی موجود ہیں مگر ان میں جدت آچکی ہے — پتّوں کی جگہ ریشم اور اون وغیرہ سے لباس بنتا ہے، پلوں کی تعمیر میں لوہا استعمال ہوتا ہے اور رہائش اس بنیاد پر ہے جس پر خود درخت کھڑے ہیں۔

بود و باش کے تقاضے قدیم ہیں لیکن عناصر کی دریافت کے ساتھ ساتھ تقاضوں کو پورا کرنے کے مختلف طریقے وضع ہو رہے ہیں۔

یہ شعور کے ارتقا کا سفر ہے۔

وسائل دریافت کرنے کی کوشش ہے۔

کائنات کے علوم سے آگاہی ہے۔

تصرف کی صلاحیت کا اظہار ہے۔

نعمتوں کا استعمال ہے جو اللہ نے عطا کی ہیں۔

یہ نعمتیں مٹی کے ذرّات میں چھپی ہوئی ہیں۔

پتّا، لکڑی، پتھر، لوہا، چقماق، آگ، تانبا، سونا، پیتل، چاندی اور سلیکان سب مٹی کے اندر ہیں۔ دو پتھروں کو رگڑنے سے چنگاری نکلی اور آگ دریافت ہوئی۔ سوچئے پتھر کس چیز سے بنے؟

سلیکان کے دور کی ایجادات ہم دیکھ رہے ہیں۔ اگلا دور کس دھات یا عنصر کا ہوگا، یہ وقت بتائے گا لیکن یہ ضرور ہے کہ آئندہ دور کی تعمیر میں جس شے کا عمل دخل زیادہ ہوگا، وہ مٹی کی ہی ایک شکل ہوگی اور بالآخر مٹی بن جائے گی۔

مٹی کی دنیا میں معلوم اور نامعلوم عناصر کی دریافت تحقیق و تلاش کا سفر ہے کہ مٹی جیسی نعمت سے کتنے فوائد حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ دوسری طرف یہ طرز عمل ارادی اور غیر ارادی طور پر شکر کے دائرے میں بھی آتا ہے کہ ہم نے اللہ کی عطا کردہ نعمت مٹی میں مخفی کائناتی علوم کو کس حد تک جاننے کی کوشش کی ہے۔

محترم عظیمی صاحب سے فکری نشست میں ایک شاگرد نے سوال کیا کہ شکر کیا ہے؟

انہوں نے فرمایا،

"شکر کا مطلب استعمال ہے۔ اگر آپ اللہ کی نعمتوں کو استعمال کرتے ہیں تو یہ شکر ہے۔ اگر نعمتوں کو محض جمع کرتے ہیں لیکن استعمال نہیں کرتے تو یہ ناشکری ہے۔ ایک خاندان مجھ سے ملنے آیا۔ ان کی دو بیٹیاں تھیں۔ میں نے بیٹیوں سے پوچھا کہ آپ کی الماری میں کتنے کپڑے ایسے ہیں جو ابھی تک نہیں پہنے؟

پہلی نے کہا، چالیس (40)۔

دوسری نے بتایا، 40 سے کم۔

یہ ناشکری ہے۔ ایسے کپڑوں کو کیڑے لگ جاتے ہیں۔ کسی شے کو کیڑے لگنا قدرت کی ناپسندیدگی کا اظہار ہے۔ لباس بھی شعور رکھتا ہے اور چاہتا ہے کہ مجھے استعمال کیا جائے۔ اگر لباس طویل عرصے تک الماری میں بند رہے اور استعمال نہ ہو تو کپڑے جمع کرنے والا فرد بڑا ہو جاتا ہے اور کپڑے چھوٹے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ لباس کیڑوں کو قبول کرکے آپ کے لئے ناپسندیدگی کا اظہار کرتا ہے۔"

صاحبِ یقین ہستی نے لطیف پیرائے میں فکری نشست میں شریک خواتین و حضرات کی اصلاح فرمائی تھی۔ ہم جوتے، جیولری، کپڑے، برتن، آلات وغیرہ جمع کرتے ہیں۔ ان میں اکثر چیزیں برسوں بے کار پڑی رہتی ہیں، ان کا رنگ اتر جاتا ہے اور زنگ لگ جاتا ہے۔ کیا زنگ لگنے کا عمل کیڑا لگنا نہیں ہے؟ جب شے استعمال نہ کی جائے تو یہ ناشکری کے زمرے میں آتا ہے۔ شکر اور استعمال کے پہلو پر سوچ بچار سے علم ہوا کہ یہ قانون پوری زندگی پر محیط ہے۔

خالقِ کائنات اللہ کا ارشاد ہے،

"میں نے جن اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لئے پیدا نہیں کیا کہ وہ میری عبادت (بندگی) کریں۔" (الذٰریٰت : ۵۶)

کُن کے بعد عطا کی گئی پہلی صلاحیت حواس ہیں جو الست بربکم کی آواز سے ایکٹو ہوئے۔ آواز سن کر ہر تخلیق نے مشاہدہ کیا کہ اللہ خالق ہے اور ہم مخلوق ہیں۔

اللہ نے مخلوق کو اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے اور عبادت کے تقاضے کو پورا کرنے کے لئے حواس عطا کئے ہیں۔ حواس محسوس کرنے کی صلاحیت ہے۔ باطنی علوم کے ماہرین حواس کی تعداد گیارہ ہزار بتاتے ہیں۔ ان میں بنیادی حواس پانچ ہیں — سماعت، بصارت، ادراک، چھونا اور گویائی۔ اللہ نے سماعت کے لئے کان، بصارت کے لئے آنکھیں، سمجھ بوجھ کے لئے دل و دماغ اور بولنے کے لئے آواز کی نعمتوں سے نوازا ہے۔ نعمتوں پر شکر کیسے ادا ہو—؟

الہامی کتب اور آخری آسمانی کتاب قرآن کریم میں جن و انس کے لئے حکم ہے کہ کائنات پر غور کرو، کہکشاؤں کو تسخیر کرو، دوسری دنیاؤں میں داخل ہونے کے راستے تلاش کرو، زمین کی سیر کرو، گزشتہ اقوام کے حالات سے باخبر ہو، لیل و نہار کے ردّوبدل کو سمجھو، انفس و آفاق میں نشانیاں تلاش کرو اور ہمیشہ اپنے اندر میں دیکھو۔

حواس کا حقیقی استعمال یہ نہیں کہ ہم کانوں سے سن رہے ہیں، آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، دل و دماغ سے کام لے رہے ہیں۔ اہم یہ ہے کہ ہم ان سے کیا کام لے رہے ہیں۔ کیا ان کے ذریعے کئے گئے کام عبدیت کے دائرے میں آتے ہیں یا محدود ہیں؟

نیوٹرل ذہن سے کائنات میں تفکر کرنے والا بندہ عبدیت کے دائرے میں آجاتا ہے کیوں کہ وہ غور و فکر کے ذریعے اللہ کی نشانیاں تلاش کرتا ہے اور اپنی دنیاوی ذمہ داریاں پوری کرنے کے ساتھ حواس کو کائناتی علوم سے واقفیت کے لئے استعمال کرتا ہے۔ یہ بندگی کا مقام اور حواس کا صحیح معنوں میں شکر ہے۔

مضمون لکھنے کے دوران سورۃ الدّھر کی ابتدائی آیات کی شعور پر بار بار دستک ہوئی۔

خالقِ کائنات اللہ نے فرمایا ہے،

"کیا نہیں گزرا انسان پر زمانے میں ایک وقت ایسا جب وہ ناقابلِ تذکرہ شے تھا؟ ہم نے

انسان کو مخلوط نطفے سے پیدا کیا تا کہ اس کا امتحان لیں اور اس غرض کے لئے ہم نے اسے سننے اور دیکھنے والا بنایا۔ ہم نے اسے راستہ دکھایا۔ خواہ شکر کرنے والا بنے یا کفر کرنے والا۔" (الدّھر: ۱۔۳)

آیات کی مستقل گونج مجھے فروری 2023ء کے "آج کی بات" کی جانب لے گئی جس میں ان آیات کی سیر حاصل تفہیم ہے۔

محترم عظیمی صاحب نے تحریر فرمایا ہے،

"سورۃ الدّھر کی آیات میں زمان و مکان اور لازمانیت کے فارمولے ہیں۔ یہ انسان کو کائنات میں اس کی پیدائش سے پہلے کی اسپیس سے متعارف کرواتی ہیں اور پیدائش کے بعد کی اسپیس کا علم دیتی ہیں۔ ان آیات میں یہ فارمولا بھی ہے کہ انسان کی تخلیق کس مادے سے ہوئی ہے، اس میں رنگوں کا کیا عمل دخل ہے، زوجین کے قانون کا ذکر ہے اور یہ کہ اس پورے نظام کی تخلیق کا مقصد کیا ہے اور اس میں شکرگزاری کا مقام کیا ہے۔

شکر گزاری سے مراد وسائل کا عجز کے ساتھ استعمال ہے۔ اللہ کے خالص بندے نعمتوں سے مستفیض ہوتے ہیں تو یہ بات ملحوظِ خاطر رہتی ہے کہ ہم اللہ کے دیئے ہوئے رزق میں سے خرچ کرتے ہیں۔ شکر یہ ہے کہ وسائل استعمال کرنے کے ساتھ بندہ تفکر کرے کہ یہ سب کن فارمولوں سے اور کس نظام کے تحت تخلیق ہوا ہے۔ شکر ایک اسپیس ہے جو غور و فکر سے حاصل ہوتی ہے۔ وسائل اور نعمتوں پر غور و فکر کے ساتھ اللہ کا شکر ادا کرنے والا بندہ اُس اسپیس میں داخل ہو سکتا ہے جسے اللہ نے دھر* فرمایا ہے۔"

الہامی کتب اور آخری الہامی کتاب قرآن کریم کو غیر جانبدار ذہن سے پڑھا جائے تو علم ہوتا ہے کہ دنیا میں آنے کا مقصد بہت وسیع ہے۔ آدمی تلاش کرے کہ وہ کون ہے، کس طرح تخلیق ہوا ہے، کہاں سے آیا ہے، کہاں جارہا ہے، یہ دنیا کیا ہے، اس سے پہلے اور بعد کی دنیاؤں میں کیا ہے اور کتنی دنیائیں کائنات میں موجود ہیں۔ قرآن کریم نے پیدائش کے نظام، رنگوں کی تخلیق، ٹائم اور اسپیس کے فارمولوں سے واقف ہونے اور ناواقف رہنے کو شکرگزاری اور ناشکری کے عمل سے منسوب کیا ہے۔

شکر میں خدمتِ خلق بھی شامل ہے۔ اللہ تعالیٰ

* دھر (لازمانیت۔ Timelessness)

نے ہمیں ہاتھ دیئے ہیں تاکہ ہاتھوں کے ذریعے ہم لوگوں کی مدد کریں، ضرورت مندوں کو کھانا کھلائیں، بیمار کی خدمت کریں، پرندوں کو دانہ پانی رکھیں۔ یہ ہاتھوں کی زکوٰۃ ہے۔

اللہ نے ہمیں پیر دیئے ہیں۔ پیروں کو غلط قدم سے دور رکھنا پیروں کی زکوٰۃ ہے۔

اللہ نے ہمیں آنکھیں دی ہیں، ان کو مثبت چیزوں پر مرکوز کرنا اور باہر دیکھنے کی بجائے اندر میں دیکھنا، آنکھوں کی زکوٰۃ ہے۔

اللہ نے ہمیں کان عطا کئے ہیں۔ کانوں سے غیبت سننے کی بجائے لوگوں کی آواز میں درد اور بے بسی کو محسوس کرکے دلجوئی کرنا اور اس کے ساتھ اس آواز کو سننے کی کوشش کرنا جو کائنات میں دَور کررہی ہے اور جس نے زندگی کو قائم رکھاہے، کانوں کی زکوٰۃ ہے۔

اللہ نے زبان عطا کی ہے۔ زبان کو دل آزاری کے لئے استعمال کرنے کی بجائے نرمی اور محبت کے اظہار کے لئے وقف کرنا شکر کے دائرے میں آتا ہے۔ اگر آپ کسی کو لکھنا پڑھنا سکھادیں اور آپ کی زبان و قلم سے کسی کا ذہن اللہ کی نشانیوں میں غور و فکر کی طرف متوجہ ہو جائے تو یہ زبان کے ساتھ علم کی بھی زکوٰۃ ہے۔

> کسی دانا کا قول ہے ___ جب تک تمہارے پاس سننے والے کان اور دیکھنے والی نگاہ ہے، تم جہاں کہیں جاؤ گے، ہر شے تمہاری راہ نمائی کرے گی، ہر جگہ تمہیں ایک استاد ملے گا۔

اللہ نے سوچنے اور محسوس کرنے کے لئے دل دیا ہے۔ دل کو نرم رکھنا، بلا تفریق ہر فرد اور نوع کا خیال رکھنا قلب کی زکوٰۃ ہے۔

زکوٰۃ کا آسان مفہوم یہ ہے کہ جائز طریقے سے اپنی ضرورت پوری کرنے کے ساتھ ساتھ وسائل کو خدمتِ خلق میں خرچ کرنا۔ اللہ نے وسائل میں ساری مخلوقات کا حصہ رکھا ہے۔

ایک نعمت وقت ہے۔ وقت کو ضائع نہ کرنا اور اسے زندگی کے حقیقی مقصد کو تلاش کرنے کے لئے وقف کرنا وقت جیسی عظیم نعمت پر اللہ کا شکر ادا کرنا ہے۔ صفحات ختم ہو جائیں گے، اللہ کا شکر ادا کرنے کے لئے نعمتوں کا شمار ختم نہ ہوگا۔

شکر اور ناشکری کے میدان میں اپنا اپنا حال سب پر روشن ہے۔ ارشادِ ربانی ہے،

"اے آلِ داؤدؑ! عمل کرو شکر کے طریقے پر۔
میرے بندوں میں کم ہی شکرگزار ہیں۔"
(سبا: ۱۳)

فلاخن

(۱) پہاڑ اور چرند پرند ہم آواز ہو کر پیغمبر حضرت داؤدؑ کے ساتھ اللہ کی حمد و تسبیح کرتے تھے۔

(۲) پہاڑ اور لوہا مٹی کی صورتیں ہیں۔ حضرت داؤدؑ کو جمادات میں تصرف کی صلاحیت عطا ہوئی۔

(۳) حضرت داؤدؑ کو جنگل سے گزرنے کے دوران تین پتھر ملے۔ پتھروں نے ان سے گفتگو کی۔

(۴) پتھر ایک ہونے سے سائز میں اضافہ نہیں ہوا بلکہ ان کی توانائی ایک سائز کے پتھر میں یکجا ہو گئی۔

(۵) رسّی کے تقریباً بے وزن ہونے اور بناوٹ کی ترتیب کی وجہ سے فلاخن مہلک ہتھیار بن جاتا ہے۔

(۶) فلاخن کی آواز ختم کرنے کے لئے گرہ سے آگے کی رسّی میں خلا کی مقدار بڑھائی جاتی ہے۔

(۷) دائرہ رسّی کی لمبائی اور لچک کی حد کے مطابق پھیلتا ہے۔

(۸) دائرے کا محیط معین ہونے کے بعد محوری گردش سے توانائی ذخیرہ ہوتی جاتی ہے۔

(۹) شکل و صورت بھی ایک توانائی ہے۔ فلاخن میں دائروی حرکت غالب ہے۔

(۱۰) شے کا حجم (سائز) ثانوی ہے۔ شے میں ذخیرہ توانائی کی مقدار اہم ہے۔

(۱۱) توانائی جتنی چھوٹی شے میں جمع ہوگی، اس کی شدت بڑھے گی، رفتار اور رینج میں اضافہ ہوگا۔

(۱۲) پتھر کی توانائی اور رفتار ہدف سے جتنی زیادہ ہوگی، پتھر اسی مناسبت سے اندر جائے گا۔

(۱۳) جالوت کی پیتل سے بنی زرہ کا وزن پانچ ہزار مثقال بتایا جاتا ہے جو 24 کلوگرام کے برابر ہے۔

(۱۴) دائروں کا بننا اور ان میں توانائی ذخیرہ ہونا، گول گھمانے سے رفتار بڑھنا، ایک پتھر کے سائز میں تین پتھروں کی قوت جمع ہونا، ان پتھروں کی تین انبیائے کرام علیہم السلام سے نسبت اور فلاخن کا اس ہستی (پیغمبر داؤدؑ) کے ہاتھ میں ہونا جن کے لئے کائنات مسخر ہے ــــ یہ سب وہ عوامل ہیں جن سے بھاری بھرکم پیتل کی مقداریں ٹوٹ گئیں اور پتھر پیشانی کی ہڈی توڑ کر جالوت کے سر میں گھس گیا۔

خالدہ زبیر

سمندر کیا ہے ــــ؟

سورج کی روشنی کا جو حصہ پانی میں داخل ہوتا ہے، اس میں سرخ رنگ 10 سے 15 میٹر (49 فٹ) کی گہرائی میں جذب ہوجاتا ہے۔ اگر غوطہ خور 25 میٹر (82 فٹ) کی گہرائی میں زخمی ہوجائے تو اسے خون میں سرخی نظر نہیں آئے گی کیوں کہ سرخ رنگ کی شعاع یہاں نہیں پہنچتی۔

زمین مختلف ماحولیاتی نظاموں میں تقسیم ہے۔ پہاڑ، جنگلات، خشکی، برفانی علاقے اور سمندر، سب کا ماحولیاتی نظام الگ مگر ایک دوسرے سے مربوط ہے۔ ہر نظام وسائل سے بھرپور ہے۔ باقی نظاموں سے فرد کسی نہ کسی حد تک واقف ہے لیکن سمندر کا ماحول خشکی پر رہنے والوں کے لئے اجنبی ہے۔ جتنی معلومات ہیں، غوطہ خور محققین اور دستاویزی فلموں کی مرہونِ منت ہیں لیکن وہ بھی محدود ہیں۔ اس کے علاوہ ہمیں سمندر کے اندر کی دنیا کا ادراک نہیں۔

سمندر اور برفانی علاقوں کے ماحولیاتی نظام کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے اندر اجسام سینکڑوں سال تک محفوظ رہ سکتے ہیں ــــ سمندر کا اندرونی درجۂ حرارت اور پانی میں نمکیات کی زیادتی سے اجسام کے سالمات (مالیکیولز) میں بانڈنگ دیر تک برقرار رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سمندر میں ڈوبنے والی اشیا اور جہازوں کے ملبے سالوں بعد بھی محفوظ حالت میں ملتے ہیں۔

دنیا کے آثار و احوال اور تاریخ پر سے اٹھنے والے پردے بتاتے ہیں کہ غرق آب ہونے والی تہذیبیں سمندروں کے اندر کسی مقام پر محفوظ ہیں جو کبھی نہ کبھی ظاہر ہوتی ہیں۔

سمندر کے اندر ایک خاص حد کے بعد تاریکی کیوں نظر آتی ہے ــــ؟ ذہن تحقیق میں مشغول تھا کہ خیال آیا ــــ جب رات ہوتی ہے تو اندھیرا ہوتا ہے، دن نکلتا ہے تو روشنی ہوجاتی ہے۔ رات میں دن کی طرح نظر کیوں نہیں آتا جب

کہ نظر آتا ہے—؟ جاننے کے لئے غور و فکر کیا۔ رات میں دن اور دن میں رات دیکھنے کی کوشش کی تو ادراک ہوا کہ میں نے دیکھنے کے لئے خود کو سورج کی روشنی کا پابند کیا ہے اسی لئے سورج کے غروب ہوتے ہی فضا میرے لئے اندھیر نگری بن جاتی ہے۔ سچ یہ ہے کہ اندھیرا بھی روشنی ہے۔ بصارت ہو کر بھی آدمی دیکھنے کے لئے دوربین کے لینس، سورج، چاند اور بلب کی روشنی کا پابند ہو تو اسے اندھا کہیں گے یا بینا—؟

سمندر میں اتریں تو جہاں تک سورج کی روشنی پہنچتی ہے، آنکھ پانی میں دنیا دیکھتی ہے، اس کے بعد تاریکی غالب ہو جاتی ہے۔ لاشعور ظاہر کرتا ہے کہ سمندر رنگوں سے مزین دنیا ہے، اس کے ہر طبقے میں رنگین مخلوقات ہیں پھر کیسے ممکن ہے کہ سمندر کا کوئی طبقہ تاریک ہو—؟

سماوات اور ارض نور سے بنے ہیں۔ سمندر زمین کا حصہ ہے۔ اس میں ایک حد کے بعد سورج کی روشنی پردہ بن جاتی ہے لیکن سمندر نور کی لہروں سے خالی نہیں ہوتا۔ خشکی کی طرح آدمی سمندر میں بھی وہاں تک دیکھتا ہے جہاں تک سورج کی روشنی جاتی ہے۔ دیکھنے کی اس طرز کے بارے میں قرآن کریم میں ارشاد ہے،

"بظاہر تمہیں ایسا نظر آتا ہے کہ وہ تمہاری طرف دیکھ رہے ہیں مگر فی الواقع وہ کچھ نہیں دیکھتے۔" (الاعراف: ۱۹۸)

سائنس کے مطابق روشنی ایک لاکھ چھیاسی ہزار دو سو بیاسی میل فی سیکنڈ کی رفتار سے خشکی میں سفر کرتی ہے۔ پانی میں روشنی کی رفتار کم ہو جاتی ہے۔ ماہرینِ بحریات کہتے ہیں کہ گہرے سمندروں اور دریاؤں میں دو سو میٹر (656 فٹ) کے بعد روشنی تقریباً معدوم ہو جاتی ہے اور ایک ہزار میٹر (3,281 فٹ) کے بعد گہرا اندھیرا ہے جس کو dark zone کہتے ہیں۔

ذہن میں سوال ابھرتا ہے کہ کائنات کا کوئی گوشہ بے رنگ نہیں پھر سمندر میں ڈارک زون کیا ہے—؟ کیا پانی کی دنیا واقعی تاریک ہے یا جن لوگوں نے خود کو سورج کی روشنی کا پابند سمجھ لیا ہے، وہ اسے تاریک دیکھتے ہیں؟

سمندر کے تاریک طبقات کے بارے میں بحر و بر کے خالق اللہ کا ارشاد ہے،

"جنہوں نے کفر کیا ان کی مثال ایسی ہے جیسے دشتِ بے آب میں سراب کہ پیاسا اس کو پانی سمجھے ہوئے تھا مگر جب وہاں پہنچا تو کچھ نہ پایا

بلکہ وہاں اس نے اللہ کو موجود پایا جس نے اس کا پورا پورا حساب چکا دیا اور اللہ کو حساب لیتے دیر نہیں لگتی۔ یا پھر اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک گہرے سمندر میں اندھیرا کہ اوپر ایک موج چھائی ہوئی ہے۔ اس پر ایک اور موج اور اس کے اوپر بادل۔ تاریکی پر تاریکی مسلط ہے۔ آدمی اپنا ہاتھ نکالے تو اسے بھی نہ دیکھ سکے۔ جسے اللہ نور نہ بخشے، اس کے لئے پھر کوئی نور نہیں۔" (النور: ۳۹۔۴۰)

سمندر میں ہر طبقے کی فضا دوسرے طبقے سے مختلف ہے۔ دو طبقات مختلف ہوں تو مطلب یہ ہے کہ ان کی فضا اور رنگ ایک دوسرے سے منفرد ہیں یعنی تاریک نظر آنے والے طبقات درحقیقت رنگین ہیں۔

پروفیسر درگا پرساد راؤ علم البحر کے ماہرین میں سے ہیں۔ سورۂ نور کی آیت 40 کا مطالعہ کرکے جو تفہیم لکھی، وہ مختصر پیشِ خدمت ہے۔

" تحقیقات بتاتی ہیں کہ سمندر کی گہرائی میں بالکل اندھیرا ہے۔ آدمی آلات کی مدد کے بغیر پانی میں 20 میٹر (65 فٹ) سے 30 میٹر (98 فٹ) تک غوطہ لگا سکتا ہے مگر اس کے جسم میں اتنی قوت نہیں کہ 200 میٹر سے زیادہ گہرائی میں پانی کا دباؤ برداشت کر سکے۔ قرآن کریم کی یہ آیت گہرے سمندروں سے متعلق ہے کیوں کہ اس میں وسیع اور گہرے سمندر کی تاریکی کا حوالہ ہے۔ گہرے سمندروں میں تہ در تہ تاریکی کے دو اسباب ہیں۔

① روشنی منشور (prism) سے ٹکراتی ہے تو شعاع رنگوں میں تقسیم ہو جاتی ہے اور سات رنگ نظر آتے ہیں۔ ان رنگوں میں بنفشی، نیلا، سبز، آسمانی، زرد، نارنجی اور سرخ شامل ہیں۔ شعاع پانی سے ٹکراتے ہی انعطاف* کے عمل کی وجہ سے مڑ جاتی ہے۔ جو حصہ پانی میں داخل ہوتا ہے، اس میں سرخ رنگ 10 سے 15 میٹر (49 فٹ) کی گہرائی میں جذب ہو جاتا ہے۔ اگر غوطہ خور 25 میٹر (82 فٹ)

* لہر یا شعاع کا رفتار کی تبدیلی کی وجہ سے مڑنا انحراف یا انعطاف (Refraction) کہلاتا ہے۔ یہ عموماً تب ہوتا ہے جب شعاع لطیف میڈیم سے کثیف میڈیم میں داخل ہوتی ہے۔ چوں کہ مختلف میڈیم میں شعاعوں کی رفتار مختلف ہوتی ہے اس لئے شعاع کے آگے بڑھنے کی سمت تبدیل ہو جاتی ہے۔ چھڑی کا پانی میں ٹیڑھا نظر آنا بھی انعطاف (Refraction) کے قانون کی وجہ سے ہے۔ تجربہ کیجئے۔

کی گہرائی میں زخمی ہو جائے تو اسے خون میں سرخی نظر نہیں آئے گی کیوں کہ سرخ رنگ کی شعاع یہاں نہیں پہنچتی۔ سورج کی روشنی سفر جاری رکھتے ہوئے پانی میں آگے بڑھتی ہے تو اس میں موجود نارنجی رنگ کی شعاع 30 میٹر (98 فٹ) سے 50 میٹر (164 فٹ) تک کی گہرائی میں نفوذ کرتی ہے۔ اسی طرح 50 سے 100 میٹر (328 فٹ) تک زرد رنگ جذب ہوتا ہے۔ 100 سے 200 میٹر تک سبز رنگ جب کہ نیلا اور بنفشی رنگ 200 میٹر سے زیادہ گہرائی میں مکمل طور پر جذب ہو جاتا ہے۔ رنگوں کے ترتیب وار غائب ہونے سے سمندر بھی تہ در تہ تاریک ہوتا جاتا ہے۔ جس طرح روشنی کی پرتیں ہیں، اندھیرے کا ظہور بھی پرت در پرت ہوتا ہے۔ ہزار میٹر سے زیادہ کی گہرائی میں مکمل اندھیرا ہے۔

سمندر میں تاریکی کا دوسرا سبب یہ ہے،

(۲) دھوپ کی شعاعیں بادلوں سے ٹکراتی ہیں تو روشنی کا کچھ حصہ بادلوں میں جذب ہو جاتا ہے اور باقی شعاعیں منتشر ہو جاتی ہیں۔ نتیجے میں بادلوں کے نیچے اندھیرے کی ایک تہ بن جاتی ہے۔ یہ اندھیرے کی پہلی تہ ہے۔ جب شعاعیں سمندر کی سطح سے ٹکراتی ہیں تو سطح پر لہریں کچھ شعاعوں کو منعکس کر دیتی ہیں جس سے چمک کا تاثر پیدا ہوتا ہے۔ کچھ حصہ پانی میں جذب ہو جاتا ہے۔ منعکس شدہ موجیں سمندر میں تاریکی کا سبب بنتی ہیں کیوں کہ وہ اندر داخل نہیں ہوتیں، واپس ہو جاتی ہیں۔ یوں سمندر دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ ایک سطح اور دوسرا گہرائی۔ دونوں حصوں میں امتیاز کی وجہ موجیں ہیں۔ سمندر کی اندرونی موجوں نے گہرے پانی کو ڈھانپ لیا ہے اس لئے اندر اندھیرا ہے۔ اس گہرائی میں آبی مخلوقات کے لئے دیکھنے کا ذریعہ ان کے جسم سے نکلنے والی روشنی ہے۔

واضح رہے کہ سطح پر موجوں کی طرح اندر بھی موجیں بنتی اور ختم ہوتی ہیں تاہم مادی آنکھ ان کو نہیں دیکھتی جب تک کہ اس مقام کے درجۂ حرارت اور کھارے پن کی ہیئت کا علم نہ ہو۔ یہ موجیں اس مقام پر بنتی ہیں جہاں کم کثافت کا حامل پانی زیادہ کثیف پانی سے ملتا ہے۔ سمندر اور دریا کی اندرونی موجوں نے گہرے پانی کو ڈھانپ لیا ہے کیوں کہ گہرے پانی کی کثافت اوپر موجود پانی سے زیادہ ہے۔ قرآن کریم نے اس بات کو جامع الفاظ میں بیان کیا ہے۔ 'یا پھر اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک گہرے سمندر میں اندھیرا کہ اوپر ایک موج چھائی ہوئی ہے۔ اس پر ایک اور موج

اور اس کے اوپر بادل۔ تاریکی پر تاریکی مسلط ہے۔' یعنی ان لہروں کے اوپر مزید اقسام کی لہریں ہیں — وہ لہریں جو سمندر کی سطح پر پائی جائیں۔ اسی تسلسل میں آیت میں ارشاد ہے کہ ' پھر اوپر سے بادل چھائے ہوئے ہیں'۔ غرض اندھیرے جو اوپر تلے پے درپے ہیں جیسا کہ وضاحت کی گئی ہے، یہ بادل وہ پے در پے رکاوٹیں ہیں جو مختلف سطحوں پر روشنی کے مختلف رنگ جذب کرکے اندھیرے کو بڑھاتی چلی جاتی ہیں۔"

پروفیسر درگا پرساد راؤ کہتے ہیں کہ 1400 سال پہلے عام شخص سمندر کی دنیا کی ایسی وضاحت نہیں کرسکتا تھا جو قرآن کریم میں ہے۔ یقیناً یہ معلومات مافوق الفطرت ذریعے سے آئی ہیں۔

حاصلِ تحریر: کائنات میں لاشمار رنگ ہیں مگر محدود حواس میں مقید فرد صرف ان رنگوں کو دیکھتا ہے جو منشور (prism) سے گزر کر تقسیم ہوتے ہیں اور — ان رنگوں میں بھی اس کی نگاہ سات رنگ اور ان کے خلط ملط سے بننے والے رنگوں تک محدود ہے۔

سمندر کی گہرائی میں سفر کریں تو وہ رنگ درجہ بدرجہ کم ہوتے جاتے ہیں جن کو مادی آنکھ دیکھتی ہے۔ مادی آنکھ کے لئے جہاں یہ رنگ کم یا غائب ہوتے ہیں، وہ مقام اندھیرا بن جاتا ہے جب کہ وہاں اندھیرا نہیں ہے بلکہ وہ رنگ ہیں جن کو ہم نہیں دیکھ رہے۔

لب لباب یہ ہے کہ کائنات نور سے بنی ہے، اس میں اندھیرا نہیں ہے۔

اصل اندھیرا نور سے ناواقفیت ہے۔

سمندر اور ڈائی مینشن —؟

ایک شخص کھیت کھلیانوں، میدانوں، وادیوں اور جنگلوں سے گزرا۔ راستے میں سمندر آیا۔ اس نے عجیب نظارہ دیکھا — وہ پانی کی دو حالتوں کی فصیل پر کھڑا تھا۔ ایک طرف خشکی (جنگل) تھی، دوسری جانب مائع (سمندر) تھا۔ ان کے بیچ کھڑے ہوکر انکشاف ہوا کہ پانی جب تک اپنی صفات (رنگوں) کو ظاہر نہیں کرتا، اس کا مشرق، مغرب، شمال اور جنوب مغلوب رہتے ہیں۔ پانی میں سے رنگ ظاہر ہوتے ہیں اور ہر دو رنگوں میں خلا نمایاں ہوتا ہے تو پہاڑ اور جنگل بن جاتے ہیں۔

عظیمی

روغن گلوسبز

پُرسکون نیند لاتا ہے

سر کے جملہ امراض اور

ہائی بلڈ پریشر میں مفید ہے

چاند کی کرنیں جذب کر کے تیار کیا جاتا ہے

عبداللہ

برگِ سبز

رشیدہ نے کہا، قرآن کریم کی وہ آیت مجھے کسی آن نہیں بھولتی جو بے سہاروں کے لئے بہترین سہارا ہے۔ کاش کہ آپ عربی سے واقف ہوتے تو سن کر وجد میں آجاتے۔

پان والے کی دکان پر سبز و سرخ چمک دار حروف میں "برگِ سبز تحفۂ درویش است" کا سائن بورڈ دیکھ کر میں ٹھٹکا۔ برگِ سبز اور پان کی نسبت میں وہ ادبی لطف آیا کہ قدم خود بخود دکان کی طرف اٹھ گئے۔ سوچ رہا تھا کہ پان والے کو شاعرانہ تخیل کیسے آیا۔ شیخ سعدیؒ نے تربوز بیچنے والے کو "من قاشِ فروش دل صد پارۂ خویشم*" بتا دیا تھا، شاید اسی طرح کسی نے پان والے کو برگِ سبز کا نسخہ بتا دیا ہو۔ خیر دکان پر پہنچا تو ایک آتا تھا، ایک جاتا تھا۔ پان والے کی طرف پیسے بڑھائے اور کہا، بھئی دو پان دینا۔

آواز سن کر وہ میری طرف متوجہ ہوا۔ پیسے لیتے وقت آنکھیں چار ہوئیں — ظفر!

میرا نام پکار کر پان والا دکان سے باہر آیا اور گلے لگ گیا۔ میں حیران تھا کہ یہ کون ہے جو اس بے تکلفی سے گلے ملا ہے؟ مجھ سے شناسائی کب رہی، وہ بھی اس بے تکلفی کی؟ میں اعلیٰ ادارے سے گریجویٹ اور اب بڑے ادارے میں اچھے عہدے پر فائز جب کہ یہ پان والا!

اِدھر اُدھر دیکھا کہ کوئی جاننے والا تو نہیں دیکھ رہا جو میرے متعلق نہ جانے کیا سوچے۔

پان فروش میری طرف سے سرد مہری اور فرار کی کیفیت محسوس کر کے بولا، ظفر! شاید تم نے اپنے حبیب کو نہیں پہچانا۔

حبیب! تم اور پان کی دکان —؟ میں نے یقین نہ آنے والے انداز میں کہا۔ اس نے دکان پر لڑکے کو کچھ ہدایات دے کر مجھ سے کہا، گھر چلو۔

میں نے پوچھا، حبیب! یہ تمہیں کیا سوجھی؟

* من قاشِ فروش دل صد پارۂ خویشم (میں نے اپنا ٹکڑے ٹکڑے دل سرِ عام بیچ دیا۔)

گریجویٹ ہوکر پان بیچنے بیٹھے، ملازمت نہیں ملی تھی تو میرے پاس آجاتے۔

حبیب میرے کسی فقرے پر زیرلب مسکرا دیتا۔ جب میں اس کے پیچھے پڑ گیا تو اس نے کہا، بھائی!سب عرض کروں گا، گھر تو چلو۔

گھر پہنچ کر وہ خاطر مدارات میں مشغول تھا اور میں اس کی علمی تباہی پر افسوس کر رہا تھا۔ بار بار ایک ہی بات کہتا کہ گریجویٹ ہوکر پان بیچنا علم کی توہین ہے۔

خاطر تواضع کا انتظام کرکے وہ بیٹھا تو کہنے لگا، دوست ! میرا بھی یہی خیال تھا۔ تم جانتے ہو کہ میرا ماسٹرز کا ارادہ تھا لیکن والد کی اچانک بیماری اور موت سے خواہش ادھوری رہ گئی۔ ان کی تنخواہ سے گھر چلتا تھا اور اسی پر میری تعلیم کا انحصار تھا۔ ان کی موت نے ہمیں معاش کی فکر میں مبتلا کر دیا۔ بی اے کے بعد جب گھر آیا تو پھر یونیورسٹی کا رخ نہیں کیا۔

ایک لطیفہ اور سناؤں۔ والد کی دیرینہ تمنا تھی کہ اپنی زندگی میں میرے سر پر سہرا دیکھتے۔ نہ معلوم ان کو کیسے احساس ہوگیا تھا کہ بیماری سے جانبر نہ ہوسکیں گے۔ چٹ منگنی پٹ بیاہ ہوا اور گھر میں دلہن کا اضافہ ہوگیا۔

میں حبیب کی بات سن کر مسکرا دیا۔

وہ بولا، مسکراتے کیا ہو؟ میرا بھی یہی خیال تھا کہ اس وقت شادی کی کیا تُک ہے مگر بھائی، ہونے والی بات ہوکر رہتی ہے۔ بہو کے آنے کے کچھ دن بعد ابا اللہ کو پیارے ہوگئے۔ مجھ پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا — میں یونیورسٹی میں بہترین کھلاڑی تھا۔ فٹ بال، ہاکی، کرکٹ، باسکٹ بال وغیرہ میں پیش پیش رہا۔ کتابی تعلیم میں بھی کسی سے پیچھے نہ تھا اور ابلاغ میں تو میرا جواب نہ تھا مگر ساری قابلیت دھری کی دھری رہ گئی۔ جب انتہائی کوشش کے باوجود کہیں ملازمت نہ ملی اور والدہ نے ایک دن کہا کہ بیٹا! کل کھانے کو نہیں ہے تو زندگی میں پہلی بار "پیروں کے نیچے زمین سرکنے" کے معنی سمجھ میں آئے اور والد کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوا۔

نئی نویلی بیوی کے سامنے جاتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ! اس عمر میں کس کو اچھا پہننے، اچھا کھانے کو جی نہیں چاہتا۔ جب اس سے بات کرتا تو خفّت کے ساتھ۔ سچ کہتا ہوں، میں نے بیوی کو انگوٹھی تک نہیں دی مگر واہ! شریکِ حیات ہو تو رشیدہ کے جیسی، مجال ہے جو شکایت کی ہو۔

ایک دن ملازمت کی تلاش میں مارا مارا پھر کر

ناامید واپس ہوا تو ارادہ کرلیا کہ بس ایک نظر ماں اور بیوی کو دیکھ لوں، اس کے بعد اندھیرے میں ریل کی پٹری پر چلا جاؤں گا۔ یہی جذبات لے کر گھر آیا۔ جو کچھ روکھی روٹیاں گھر پر تھیں، اس کو دنیا کی آخری نعمت سمجھ کر کھایا۔ جب سب سو رہے تھے، میں تقریباً بارہ بجے بستر سے اٹھا۔ عین اسی وقت بیوی چونکی، خیر ہے جی؟

چور کا دل ہی کتنا ہوتا ہے۔ میں اٹھتے اٹھتے پھر چارپائی پر گر گیا۔ وہ بولی، اس وقت کچھ گھبرائے ہوئے معلوم ہوتے ہو، کیا بات ہے؟

میں نے کہا، اچھا ہوں، بس نیند نہیں آرہی۔

وہ کہنے لگی، جانتی ہوں نیند کیوں نہیں آرہی۔

میں نے کہا، میرا حال کسی سے چھپا نہیں، اب تو کچھ اور ہی ارادہ ہے۔

اس نے فوراً پوچھا، اب کیا ارادہ ہے؟

میں نظریں چراتے ہوئے خاموش رہا۔

ہائیں! آپ ایسا سوچتے ہیں؟ یا اللہ!

رشیدہ! کیا کروں؟ غیبی مدد بھی تو نہیں ہوتی۔ ایسا لگتا ہے کہ دروازے بند ہیں۔

رشیدہ نے کہا، کیا اللہ نے رزق کا ایک ہی دروازہ بنایا ہے جس کا نام پڑھے لکھے لوگوں نے ملازمت رکھا ہے اور ملازمت بھی ایسی جو اپنی خودداری کو بھینٹ چڑھا کر خوشامد اور چاپلوسی سے حاصل کی جائے یا کسی دباؤ کے اثر سے ملے ——؟ اگر کسی نہ کسی طرح مل جائے تو جب تک افسر کی جا بے جا، ہاں میں ہاں نہ ملائی جائے، اس کا نبھانا ممکن نہیں۔ آپ نے اس ملازمت کے نہ ملنے پر یہ سمجھ لیا کہ رزق کے تمام دروازے بند ہو گئے ہیں؟ حیرت یہ ہے کہ جو لوگ نشیب و فراز سے گھبرا کر انتہائی قدم اٹھانے پر آمادہ ہو جاتے ہیں، ان کی غیرت اس وقت کہاں چلی جاتی ہے جب وہ خوشامد اور جھوٹ کو قبول کر لیتے ہیں——؟

ظفر! تم یقین کرو کہ یہ رشیدہ کی پہلی طویل گفتگو تھی ورنہ اس سے پہلے جی ہاں، جی اچھا اور ہوں ہاں کے علاوہ پورا فقرہ اس کی زبان سے نہیں سنا تھا۔ میں اپنی سوچ پر پشیمان ہو گیا اور پوچھا کہ تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟ دیکھتی نہیں ہو کہ گھر کی حالت کیا ہے۔ کون نہیں چاہتا کہ چار پیسے ہوں تو دل کے ارمان نکلیں، مجھے اپنے ارمانوں کا اتنا خیال نہیں لیکن اماں اور تمہیں بوسیدہ کپڑوں میں دیکھتا ہوں تو——؟

وہ ٹوکتے ہوئے بولی، کس نے کہا کہ مجھے آپ کے گھر میں تکلیف ہے؟ اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں

کہ کھانے پہننے کو مل جاتا ہے۔ قرآن کریم کی وہ آیت مجھے کسی آن نہیں بھولتی جو بے سہاروں کے لئے بہترین سہارا ہے۔ کاش کہ آپ عربی سے واقف ہوتے تو سن کر وجد میں آجاتے۔

اللہ نے فرمایا ہے،

”جو کوئی اللہ تعالیٰ کے لئے تقویٰ اختیار کرے گا تو اللہ اس کے لئے کوئی راہ پیدا فرمائے گا اور اس کو ان طریقوں سے روزی پہنچائے گا جو اس کے وہم و گمان میں نہ ہوں۔“

رشیدہ اتنا کہہ کر خاموش ہوگئی۔ شاید وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ مجھ پر کیا اثر ہوا۔

تمہیں یاد ہے ظفر! جب پروفیسر مجیب نے ایک دن کہا تھا کہ طالب علموں کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہئے اور میں نے برجستہ کہا تھا کہ پیروں پر کھڑے ہونے سے بہتر ہاتھوں پر کھڑا ہونا ہے۔ جب مجھ سے اس کی تشریح کروائی گئی تو میں نے ہاتھوں پر کھڑے ہونے کے کیا کیا معنی بتائے تھے۔ پھر یونیورسٹی میں یہ کہاوت مشہور ہوگئی تھی کہ طالب علموں کو اپنے ہاتھوں پر کھڑا ہونا چاہئے — لیکن بیوی کے سامنے ساری منطق طاقِ نسیاں ہوگئی۔ میں نے کسی نہ کسی طرح کہا، رشیدہ! پھر آخر میں کیا کروں؟

کوئی چھوٹا موٹا روزگار کرلیجئے!

لیکن روزگار کے لئے پیسے کی ضرورت ہے اور گھر کی حالت تمہیں پتہ ہے۔

اللہ کے نام کے سوا اور چاہئے کیا؟ آپ کو چند پیسوں کا روزگار بتاؤں۔

میں نے کہا، بتاؤ؟

پان کی دکان کھول لیجئے۔

پان کی دکان —؟ میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

آہ! میری قیمت تمہاری نظر میں یہ ہے!

اس نے میری بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا، خوشامد اور چاپلوسی سے ملنے والی ملازمت سے بہتر اپنا کام ہے۔

ظفر میاں! شاید تم ہنس پڑو، روشن خیالی کی وہ گرما گرمی کافور ہوگئی جو یونیورسٹی کی پیداوار ہوتی ہے۔ رشیدہ کے اس انداز نے مجھے جھنجوڑ دیا۔ رگوں میں نیا خون اور بازوؤں میں نئی طاقت محسوس ہوئی لیکن ماحول کا اثر آسانی سے آدمی کو اپنی حدود سے نکلنے نہیں دیتا۔ دبے ہوئے الفاظ میں کہا، مجھے پان بنانے نہیں آتے۔

وہ بولی، اونہہ! پان بنانے نہیں آتے جیسے یہ کوئی ایسا کام ہے جس کے سیکھنے کی ضرورت ہو۔ اللہ کا نام لے کر ذرا سی جگہ پر بیٹھ جایئے۔ باقی

انتظام میرے ذمے۔ بس آپ یہ کیجئے کہ پان پر کتھا چونا پوت پات کر گاہک کو دیجئے اور گلوری بنانا کوئی کمال تو ہے نہیں، چٹکی بجاتے آتا ہے۔

رشیدہ نے اپنے پان دان سے ایک پان بنا کر مجھے دیا۔ میں نے مسکرا کر پان لیا اور کہا، استاد! یہ تو سب ٹھیک ہے مگر ہمت نہیں پڑتی۔

کہنے لگی، ہمت ہے بس بگڑے ہوئے ماحول سے لڑنے کی ضرورت ہے۔ دعوے کے ساتھ کہتی ہوں کہ اگر آپ پان کی دکان کرلیں تو وہ نوجوان جو مایوس ہیں، آپ کو دیکھ کر چھوٹے چھوٹے پیشوں کی طرف بڑھیں گے۔ مانا کہ شروع میں لوگ کہیں گے کہ "ہائیں! تم اور پان کی دکان" مگر یقین جانیں چند دنوں بعد خود آپ سے مشورہ نہ کریں تو میرا نام بدل دیجئے گا۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ کتنے نوجوانوں کی زندگی آپ کے قدم سے سنور جائے گی اور اس کا اجر آپ کو ملے گا۔

حبیب کی باتیں سن کر مجھے جیسے سانپ سونگھ گیا۔ وہ بولا! ایک ایرانی نے عورت کے ادنیٰ اشارے پر پہاڑ کھود ڈالا تھا۔ میرے لئے بھی یہ پہاڑ کھودنے جیسا تھا۔ حیرت یہ تھی کہ جس عورت نے کبھی ہوں ہاں سے زیادہ بات نہیں کی، آج زبان کھلی تو "تا مرد سخن نگفتہ باشد" کی تفسیر بن گئی—جب تک آدمی خاموش رہتا ہے، اس کے عیب و ہنر مخفی رہتے ہیں۔

صبح والدہ کو بتایا تو انہوں نے دعا دی۔ کہنے لگیں کہ کسی کام میں شرم محسوس نہ کرنا، محنت سے کیا گیا کوئی کام چھوٹا نہیں ہوتا۔

ایک پٹارے میں دو ڈھولی پان، کتھے چونے کی کلیاں اور چھالیوں کی ڈلیا رکھ کر اپنے خیال میں جہاد پر روانہ ہوا۔ یہ سامان رشیدہ نے اپنے پاس سے منگوایا تھا۔

اس دن ساری دنیا مجھ پر ہنسی۔

کسی نے کہا، کام تو خوب ہے مگر تمہیں زیب نہیں دیتا۔ یہ اور اس قسم کے جملے سننے کو ملے۔ حالت یہ تھی کہ پان بنانا نہیں آتا تھا مگر جیسے تیسے لپیٹ کر دیتا تھا۔ شام کو اٹھا تو جیب بھری ہوئی تھی۔ دوسرے دن پھبتیوں اور آوازوں کی وہ زور وزاری نہ تھی مگر کچھ جاننے والے فقرہ بول جاتے تھے۔ ہفتہ گزرنے کے بعد جب کوئی اس قسم کی بات کہتا تو اس کی ذہنیت پر ہنسی آنے لگی۔ آٹھ دس دن میں کیا سے کیا ہوگیا۔ چوتھے روز محلے کے ایک نوجوان نے چائے کا ڈھابا کھول لیا، ساتویں روز دوسرے نے پھل بیچنا

شروع کر دیئے۔ وہ سائن بورڈ جو تمہیں میری دکان کی طرف لایا، میں نے تیسرے مہینے بنوایا تھا۔ ان ذرا ذرا سے کاموں میں اللہ نے اتنی برکت دی کہ کیا بتاؤں۔ اب میں زکوٰۃ دینے والوں میں سے ہوں اور دکان پہ ملازم بھی رکھ لیا ہے۔ ہاں! ایک بات اور — پان میں کسی قسم کی ملاوٹ نہیں کرتا۔ ہر چیز صاف ہے۔

آخر میں وہ بولا، ظفر! یہ ہے برگِ سبز تحفۂ درویش است کی داستان۔ جس دن چاہتا ہوں، دکان پر جاتا ہوں، جس دن جی چاہتا ہے، گھر میں رہتا ہوں، کسی کا غلام نہیں، کسی کی دھونس نہیں، آزاد پیشہ — بس ایک اللہ کا خیال رہتا ہے جس نے مجھے رزقِ حلال کی طرف متوجہ ہونے کی توفیق بخشی۔ ملازمت میں یہ مزے کہاں! تم تو واقف ہو، بھگت ہی رہے ہو گے۔ تم نے کتابوں میں دہلی کے پان کا پڑھا ہے، مغل اور نواب شوق سے کھاتے تھے۔ اب آئے ہو تو میری دکان کا پان بھی کھانا۔

حبیب نے آپ بیتی ختم کی تو میں نے لمبی سانس لی۔ دل کی بات یہ ہے کہ مجھے حبیب کی زندگی پر رشک آرہا تھا۔

پان کے دلدادہ کہتے ہیں کہ جہاں پان ہے وہاں پان دان ہے اور جہاں یہ دونوں ہیں وہاں ایک خوش باش خاندان ہے۔ پان سنسکرت زبان کے لفظ پرنا سے ماخوذ ہے جس کے معنی پتّا ہے۔ پان کھانے اور کھلانے کی روایت برصغیر کی ثقافت کا حصہ ہے۔ مغل دور میں پان بڑے اہتمام سے کھایا جاتا تھا۔ بادشاہ پان کا بیڑہ اٹھاتا تو مطلب یہ تھا کہ ضیافت اختتام کو پہنچی۔ ہر پتّا کیوڑے اور عرقِ گلاب سے تر ہوتا۔ شاہی بیڑہ گیارہ پتّوں کے پان کا ہوتا تھا۔ چھالیہ صندل کے پانی میں ابالی جاتی جب کہ چونا زعفران کی خوش بو سے مہکتا تھا۔ پان کھانا اتنا عام تھا کہ محقق ابو ریحان البیرونی نے "کتاب الہند" میں لکھا کہ ہندوستان کے لوگوں کے دانت سرخ ہوتے ہیں۔

بڑے بڑے شعرا نے پان پر شعر کہے۔ شہنشاہِ سخن میر تقی میرؔ نے لکھا ہے،

جب ہم کلام ہم سے ہوتا ہے پان کھا کر
کس رنگ سے کرے ہے باتیں چبا چبا کر

اکبرؔ الٰہ آبادی نے کہا،

لگاوٹ کی ادا سے ان کا کہنا پان حاضر ہے
قیامت ہے ستم ہے دل فدا ہے جان حاضر ہے

پان آج بھی شوق سے کھایا جاتا ہے لیکن —؟

اظہر حسین

وہیل اور بلّی

اگر میں کہوں کہ خشکی پر رہنے والی بلّی اور پانی میں رہنے والی ٹنوں وزنی نیلی وہیل ساخت میں یکسر مختلف ہو کر بھی ایک ہیں تو آپ کا جواب کیا ہو گا—؟

کہانی پرانی ہے کہ پانی کا جہاز سفر میں تھا۔ راستہ طویل اور منزل میلوں میل تھی۔ پہلے دو دن مسافروں نے آوازوں کے بے ہنگم شور سے دور ہو کر خوشی کا اظہار کیا حالاں کہ شور پانی کی موجوں کا بھی تھا مگر بے ہنگم نہیں تھا۔ تیسرے دن کے آغاز پر مسافر جذبات اور مناظر کی یکسانیت سے گھبرا گئے — گھبراہٹ بیزاری میں تبدیل ہوئی اور مسافر دعائیں کرنے لگے کہ کوئی جزیرہ نظر آجائے جہاں ہریالی ہو اور وہ آزادانہ چل پھر سکیں۔

چوتھے روز سمندر میں خشک ٹکڑا نظر آیا جو رقبے میں چھوٹے میدان جتنا تھا اور اس پر پودے اگے ہوئے تھے۔ مسافروں کے چہرے کھل اٹھے۔ جہاز جزیرے کے کنارے لگا۔ مسافر اترے، کچھ نے چہل قدمی کی، کچھ گھاس پر لیٹ گئے، ایک گروپ نے مچھلیوں کے شکار کا ارادہ کیا — چند مچھلیاں شکار ہوئیں۔ مسافروں نے آگ جلائی۔ آگ پر مچھلیاں پکنے کے قریب ہوئیں تو جزیرہ ہلنا شروع ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے پورا جزیرہ پانی میں چھپ گیا۔

بیشتر مسافر تیراکی جانتے تھے، انہوں نے اپنی اور سب کی جان بچائی اور جہاز پر سوار ہوئے۔ ایک شور بپا تھا۔ مسافروں کے اوسان بحال ہوئے تو دیکھا کہ جسے وہ جزیرہ سمجھ رہے تھے، وہ نیلی وہیل تھی جو دھوپ لینے کے لئے کچھ دیر پانی کی سطح پر ٹھہر گئی تھی۔

وہیل ممالیہ جانور ہے۔ انڈا دینے کی بجائے بچہ جنتی ہے اور بچوں کو دودھ پلاتی ہے۔ اس کی سب سے بڑی قسم نیلی وہیل ہے۔ بالغ نیلی

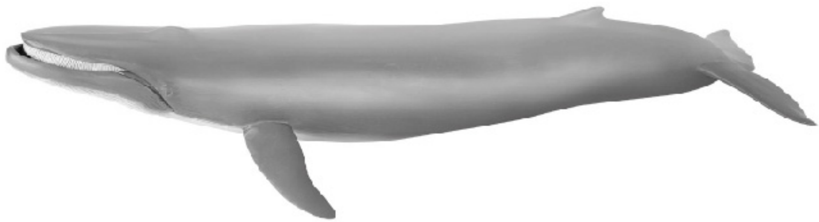

وہیل کی اوسط لمبائی 30 میٹر (تقریباً 98 فٹ) اور وزن ڈیڑھ سو ٹن کے قریب ہے جب کہ زبان کا وزن بالغ ہاتھی کے وزن کے برابر بتایا جاتا ہے۔ یہ زیادہ تر کرل* نامی سمندری مخلوق کھاتی ہے اور ایک اندازے کے مطابق اس کی روزانہ خوراک چار ٹن (چار ہزار کلوگرام) سے زائد ہے۔ ماہرین کہتے ہیں کہ نیلی وہیل کے جسم میں 356 ہڈیاں ہوتی ہیں اور نچلے جبڑے کی ہڈی تمام جانوروں میں سب سے بڑی ہے۔ پاکستان میری ٹائم میوزیم، کراچی میں وہیل کا ڈھانچا رکھا گیا ہے جو دیکھنے کے لائق ہے۔

پرانے زمانے میں برتن میں دودھ ڈال کر کمرے کی چھت سے لٹکا دیتے تھے تاکہ بلّی کی پہنچ سے دور رہے۔ اس کو چھینکا کہتے تھے۔ چھینکا ٹوٹتا تو بلّی کی عید ہو جاتی۔ اردو میں محاورہ بنا، بلّی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا — چھینکا ٹوٹنے سے بلّی کو دودھ مل گیا۔ اگر بلّی بھیگ جائے تو اس پر بھی محاورہ ہے — بھیگی بلّی۔ دنیا کے کسی جانور کے بھیگنے پر محاورہ نہیں بنا، یہ اعزاز صرف بلّی کو حاصل ہے۔ قدیم مصر میں بلّی کا ایک خاص مقام تھا۔ بادشاہ اور امرا کی منظورِ نظر بلّیوں کو حنوط کر کے ان کے ساتھ دفنایا جاتا تھا۔

دنیا کی سب سے بڑی وہیل صرف سمندر میں ملتی ہے لیکن بلّی کے ساتھ ایسی کوئی شرط نہیں۔ گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ کے مطابق ایک امریکی خاتون کے پاس دنیا کی سب سے بڑی بلّی ہے جو دو پاؤں پر کھڑی ہو تو قد 18.3 انچ بنتا ہے۔ اس کے بھائی بلّے کا قد 19.05 انچ تھا۔ جب بھائی کا انتقال ہوا تو بہن کو دنیا کی سب سے بڑی بلّی ہونے کا اعزاز ملا۔ بلّی میں 240 سے 245 ہڈیاں ہوتی ہیں جن میں سب سے بڑی

* Krill خول دار کیکڑے کی طرح آبی جانور ہے۔

ران کی ہڈی ہے۔ ایسے میں 18 انچ بلّی کی ران کی ہڈی کتنی بڑی ہو گی، آپ اندازہ لگا سکتے ہیں۔

قارئین سوچیں گے کہ وہیل کے ساتھ بلّی کا ذکر کیوں کیا گیا ہے۔ ان کی ساخت، قد اور وزن میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ایک گاڑی میں کئی بلّیاں آتی ہیں جب کہ نیلی وہیل کے دل کا سائز گاڑی کے برابر ہے۔ ظاہر میں ان کا کوئی موازنہ نہیں کہ ایک خشکی پر رہتی ہے اور دوسری پانی میں۔ اگر بات پانی کی بلّی کی ہو تو اس کا قد وہیل کے بازو جتنا بھی نہیں۔ اس کے باوجود ان دونوں میں مماثلت ہے۔ اگر میں کہوں کہ ساخت میں یکسر مختلف ہو کر بھی یہ دونوں ایک ہیں تو آپ کا جواب کیا ہو گا — ؟

کان بلّی کے ہیں اور نیلی وہیل کے بھی۔ بلّی کے کان نظر آتے ہیں، نیلی وہیل کے کان نظر نہیں آتے لیکن سماعت کی صلاحیت ہے۔ آواز کی لہریں بلّی کے کان میں پردے سے ٹکرا کر ارتعاش پیدا کرتی ہیں جب کہ وہیل میں سماعت کھال کے ذریعے ہے۔ وہیل کی آنکھ سنگترے کے برابر ہوتی ہے اور بلی کی چھوٹے بیر کے برابر۔ دیکھنے کا عمل دونوں میں ہے۔ بلّی دن کے علاوہ رات میں بھی دیکھتی ہے — نیلی وہیل کے لئے آواز کی لہریں تاریکی کو روشن کر دیتی ہیں۔

ذائقے کی حس دونوں کے پاس ہے۔ جو کھاتی ہیں، ذائقے کا مزہ لے کر کھاتی ہیں۔ وہیل کی غذا سینکڑوں ٹن جب کہ بلی آدھا پاؤ کے برابر کھاتی ہے۔ ہاتھ پیر کی بات کریں تو وہیل کے پَر اس کے ہاتھ ہیں اور دُم پیر کے قائم مقام ہے۔

نر اور مادہ وہیل، بلی کی طرح قرب کا اظہار نہیں کرتے — جسم مَس کرتے ہوئے کچھ دور تک ساتھ تیرتے ہیں۔ دونوں کا تعلق ممالیہ گروہ سے ہے۔ دونوں بچے کو دودھ پلاتی ہیں۔

تحقیق و تلاش وہیل کی حسِ شامّہ اور لمس کے بارے میں معلومات کی کمی کا اعتراف کرتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ماہرین بلّی کو لیبارٹری میں رکھ کر تجربات کر سکتے ہیں، 90 فٹ سے بڑی آبی مخلوق کے ساتھ یہ نہیں ہو سکتا۔

جو تقاضے بلّی کے اندر ہیں، وہ وہیل میں بھی ہیں۔ ماہرین کہتے ہیں کہ وہیل میں سونگھنے اور لمس کی صلاحیت کم ہے۔ سوال یہ ہے،

- وہیل پانی کی موجودگی کیسے محسوس کرتی ہے؟
- کس طرح معلوم ہوتا ہے کہ آس پاس کوئی ہے اور شکار کیسے کرتی ہے؟
- اگر وہیل کے اندر سونگھنے کی قوت کم ہے تو

اپنی پسندیدہ غذا کی شناخت کیسے کرتی ہے؟

معدے کو کچھ طلب کرنا ہو تو وہ پیغام بھیجتا ہے۔ عام زبان میں اسے بھوک لگنا کہتے ہیں۔ پیاس، محبت، غصہ، غم، خوشی اور معافی جیسے جذبات ہر مخلوق میں ہیں۔ نیلی وہیل کے بچے پر جب کِلر وہیل حملہ کرتی ہے تو ماں سے برداشت نہیں ہوتا، وہ غصے سے دُم مارتی ہے۔ کِلر وہیل جانتی ہے کہ نیلی وہیل کی ٹنوں وزنی دُم اسے لگی تو خطرناک ثابت ہوسکتی ہے۔

واقعہ پڑھا کہ تیراکی کے دوران ایک صاحب کے اعصاب جواب دے گئے اور وہ سمندر میں ڈوبنے لگے۔ قریب کہیں نیلی وہیل تھی، انہیں ڈوبتے دیکھا تو فوراً قریب گئی اور پانی کی سطح تک لائی۔ اسی طرح کسی مغربی ملک میں پاگل کتّے نے چھوٹی بچی پر حملہ کر دیا۔ بچی کی پالتو بلّی نے کتّے کو بھاگنے پر مجبور کر دیا۔

اب آیئے اس نکتے پر جس کی تمہید میں یہ باتیں لکھی گئی ہیں۔ معلوم تاریخ میں زمین پر سب سے بڑی مخلوق نیلی وہیل ہو یا شیر کی خالہ بلّی ـــ دونوں کے حواس ایک ہیں، تقاضے یکساں ہیں، آنکھ، ناک، کان، زبان، ہاتھ، پیر دونوں کے ہیں پھر ان میں فرق کیا ہے؟

راقم الحروف کی دانست میں یہ فرق قد کاٹھ اور وزن کا ہے۔ یہ انفرادیت کی وجہ سے ہے ورنہ شناخت نہیں ہوگی تاہم جسمانی ساخت کا فرق الوژن ہے کیوں کہ جب یہ دونوں مٹی میں ملتے ہیں تو مٹھی بھر خاک ہو جاتے ہیں۔

ساخت مختلف ہے مگر بات حواس اور تقاضوں کی ہو تو کیا ان میں فرق کیا جاسکتا ہے ـــ؟

حواس اور جذبات میں صرف بلّی اور وہیل نہیں، تمام مخلوقات برابر ہیں اور یہی برابری ہم سب کا اجتماعی شعور ہے۔ ہاتھی اپنی جسامت کے حساب سے اور چیونٹی اپنی جسامت کے حساب سے کھاتی پیتی ہے، یہی بات وہیل کے لئے ہے۔ جسامت کی وجہ سے وہیل اور ہاتھی کی غذا زیادہ نظر آتی ہے مگر ان کو اپنی غذا کا حجم غیر معمولی محسوس نہیں ہوتا۔ بات زاویے کی ہے جس کے ذریعے چیزوں کو دیکھا جاتا ہے۔ ایسے میں اگر میں کہوں کہ نیلی وہیل اور بلّی، ہاتھی اور چیونٹی برابر ہیں تو آپ کو تعجب نہیں ہونا چاہئے۔ آپ ظاہری جسامت کو دیکھ رہے ہیں جب کہ میں حواس اور تقاضوں کی دنیا میں دیکھ رہا ہوں۔

تین کرامات

فقیر نے لڑکی کی ماں سے کہا، جس چیز کی ضرورت ہو، اس دکان سے لے لینا مگر ذخیرہ اندوزی نہ کرنا۔ اس روز کے بعد فقیر گھر آیا نہ کہیں نظر آیا۔

نوجوان نے علمِ ظاہری کی تحصیل کے بعد باطنی علوم کے حصول کے لئے سفر کا قصد کیا۔ اس نے غیر ارادی طور پر جنگل کو جانے والا راستہ اختیار کیا یہاں تک کہ کوہِ سیوستان پہنچا۔ چلتے چلتے کسی گوشے میں تنور نظر آیا جس کے اندر بڑا پتھر رکھا ہوا تھا اور تنور گرم تھا۔ نوجوان نے کچھ دیر قیام کا ارادہ کیا تاکہ معلوم ہو یہاں کون رہتا ہے۔ دن گزرا، رات آئی — کوئی نہیں آیا۔

آوازیں بتارہی تھیں کہ درندے کچھار سے نکل کر آس پاس گھوم رہے ہیں لیکن قریب نہیں آئے۔ نوجوان نے سوچا کہ ضرور یہ کسی اللہ والے کا مسکن ہے ورنہ درندے قریب آکر دور نہ رہتے۔ اگلا دن بھی گزر گیا۔ دل یہاں سے جانے پر رضامند نہ ہوا۔ تیسرے روز ایک ضعیف العمر شخص کو آتے دیکھا جن کے قدم جوان آدمی سے زیادہ سبک رفتار تھے۔ وہ ایک طرف بیٹھ گئے۔ نوجوان نے قریب جاکر سلام کیا۔ انہوں نے نظر اٹھا کر دیکھا اور باآواز بلند فرمایا، وعلیکم السلام، میر محمد! تم نے کچھ کھایا پیا؟

اجنبی شخص سے نام سن کر یقین ہو گیا کہ یہ اہلِ نظر میں سے ہیں۔ عرض کیا کہ زادِ راہ کے علاوہ قرب و جوار میں غذا میسر نہیں تھی۔

بزرگ نے اپنائیت سے کہا، کچھ دور جاکر اپنے حصے کا رزق تلاش کر لیا ہوتا۔

عرض کیا، بس یہی خیال رہا کہ اگر میری غیر موجودگی میں آپ آکر واپس تشریف لے گئے تو میں ملاقات سے محروم رہ جاؤں گا۔

فرمایا، جب تم سے ملاقات طے تھی تو محرومی کیسی؟ انہوں نے تصوف کا نکتہ بیان کر دیا۔

جب علم ہوا کہ وہ تین دن سے ان کا انتظار

کررہاہے تو فرمایا، میں دو دن سے یہیں تھا، آج کچھ دیر کے لئے گیا مگر تمہیں نہیں دیکھا۔

نوجوان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہے۔

شش و پنج میں دیکھ کر فرمایا، فقیر کو اپنی خبر نہیں پھر شب و روز کا حساب کیسے رکھے!

پوچھا، گھر سے کس کام کے لئے نکلے تھے؟

عرض کیا، شیخ خضر سیوستانیؒ کے بارے میں سنا تھا۔ ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا ارادہ تھا۔ تنور دیکھ کر یہاں ٹھہر گیا۔

فرمایا، خضر سیوستانی تو میں گناہ گار ہوں مگر پتہ نہیں کہ تم کس خضر کی تلاش میں ہو؟

نوجوان حیران رہ گیا۔

شیخ نے فرمایا، جو ہوتا ہے، اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔ بندے تو محض درمیان کا ایک واسطہ ہیں۔ وہ مختارِ کل جسے چاہے ہدایت بخشے۔

نوجوان نے حلقۂ ارادت میں داخل ہونے کی درخواست کی جو شیخ سیوستانیؒ نے قبول کی۔

یہ نوجوان حضرت میاں میرؒ تھے۔

حضرت میاں میرؒ صوبہ سندھ کے قدیم شہر سیوستان (موجودہ ضلع دادو) میں پیدا ہوئے۔ علم دوست گھرانے سے تعلق تھا۔ کم عمری میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ والدہ بی بی فاطمہؒ نے روایتی علوم کے ساتھ سلوک (روحانی) کی تعلیم کا بھی اہتمام کیا۔

مغل شہزادہ دارا شکوہ عقیدت مندوں میں سے تھا۔ وہ نوجوانی میں سخت بیمار ہوا لیکن کسی دوا نے کام نہ کیا۔ والدین حضرت میاں میرؒ کے پاس لاہور لے کر آئے۔ ان کی دعا سے شہزادہ صحت یاب ہوا۔

دارا شکوہ کی کتاب "سکینۃ الاولیا" میں لکھا ہے کہ شیخ خضر سیوستانیؒ سے تعلیم پوری ہوئی تو انہوں نے فرمایا کہ جہاں چاہو بود و باش اختیار کرو اور اللہ تعالیٰ نے اپنے لامحدود خزانوں میں سے تمہیں جو دولت عطا کی ہے، اسے اللہ کے بندوں میں حسبِ ضرورت تقسیم کرو۔ حضرت میاں میرؒ پیر و مرشد سے اجازت لے کر لاہور کی طرف روانہ ہو گئے۔ دوسری روایت کے مطابق شیخ خضرؒ کے وصال کے بعد حضرت میاں میرؒ لاہور عازمِ سفر ہوئے۔

① دارا شکوہ نے دہلی میں ایک بزرگ حاجی محمد سے کہا، حضرت میاں میرؒ کی کسی کرامت کا

احوال سنائیے۔ انہوں نے فرمایا، شیخ نے ایک درویش کی کرامت بیان کی تھی، وہ سناتا ہوں۔

"سیوستان اور بھکر کے لوگوں میں رسم تھی کہ جب تک کسی کے پاس مویشیوں کا ریوڑ یا نقد مال نہ ہو، اس کی لڑکی کے لئے کوئی شادی کا پیغام نہیں بھیجتا تھا۔ ایک شخص کو کاروبار میں نقصان ہوا۔ مفلسی کے باعث لڑکی کا رشتہ نہ ہوسکا۔ علاقے میں ایک فقیر رہتا تھا جو کبھی کبھار اس شخص کے گھر آتا اور پانی مانگتا۔ لڑکی خوشی سے پانی پلاتی اور فقیر دعائیں دے کر رخصت ہو جاتا۔

شادی کی پریشانی بڑھی تو ماں نے فقیر سے کہا، ہمارے حالات ویسے ہی ہیں جیسے آپ کے آنے سے پہلے تھے۔

فقیر مسکرادیا اور پوچھا، تم کیا چاہتی ہو؟

لڑکی کی شادی مگر دینے کو ایک سکّہ نہیں۔

فقیر نے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور چلتے چلتے بنیے کی دکان پر پہنچا۔ لڑکی کی ماں سے کہا، جس چیز کی ضرورت ہو، اس سے لے لینا مگر ذخیرہ اندوزی نہ کرنا۔ اس روز کے بعد فقیر ان کے گھر آیا نہ کہیں نظر آیا۔ عورت بنیے کی دکان سے ضرورت کا سامان لے کر آتی۔ کچھ دن بعد لڑکی کا رشتہ آیا اور تاریخ طے ہوگئی۔ بنیے نے جہیز کا انتظام کیا۔ بیٹی خیر سے رخصت ہوئی۔

بیٹی کی شادی کے بعد عورت دکان سے سودا سلف لائی تو سامان ذخیرہ کیا۔ اگلے روز کچھ اور لینے پہنچی تو وہاں دکان تھی نہ بنیا ــــ ویرانہ تھا۔

وہ حیران و پریشان واپس آگئی۔

ایک عرصے بعد فقیر دوبارہ نظر آیا تو عورت نے پوچھا، وہ سب کیا تھا اور کہاں گیا؟

فقیر نے کہا، تم نے وعدہ خلافی کی اور لالچ میں آکر رزق کا آسان ذریعہ کھو دیا۔

عورت بولی، اتنا بتادیں کہ دکان کہاں گئی؟

فقیر نے کہا، اگر دکان کا حال پوچھا تو پھر مجھے دوبارہ نہیں دیکھوگی۔ عورت کا اصرار بڑھا۔

فقیر بولا، اناج، کپڑا، دکان اور بنیا سب میں تھا۔ یہ کہہ کر وہ اوجھل ہوگیا۔"

حاجی محمدؒ کہتے ہیں کہ واقعہ سننے کے بعد میں نے حضرت میرؒ سے پوچھا، کیا وہ درویش آپ تھے؟ انہوں نے فرمایا، وہ جو بھی تھا، تمہیں اس سے کیا غرض ــــ؟ ایک واقعہ تھا جو سنا دیا گیا۔

---

(۲) لاہور میں حضرت میاں میرؒ کی شہرت ہوئی تو خاموشی سے سرہند تشریف لے گئے مگر یہاں آکر گھٹنوں میں درد اور دوسری بیماریوں

میں مبتلا ہوگئے — خدمت کے لئے تیماردار نہیں تھا۔ نعمت اللہ سرہندی نام کے ایک صاحب کو خبر ہوئی کہ لاہور سے ایک بزرگ تشریف لائے ہیں اور علیل ہیں۔ وہ حاضر ہوئے اور خدمت گزاری میں مصروف ہوگئے۔

تقریباً ایک سال بیمار رہنے کے بعد صحت عطا ہوئی تو نعمت اللہ سے فرمایا، میرے پاس مال و دولت نہیں کہ تمہیں کچھ دوں۔ اگر تم چاہو تو پروردگارِ عالمین سے تمہارے لئے باطنی علوم کی دعا کرسکتا ہوں۔

عرض کیا، آپ کی دعاؤں میں شامل ہونے سے زیادہ بڑی نعمت میرے لئے کیا ہوگی۔

حضرت میاں میرؒ نے حلقۂ ارادت میں شامل کیا اور روحانی علوم سے نوازا۔ بتایا جاتا ہے کہ نعمت اللہ سرہندی کو حضرت میاں میرؒ کے پہلے مرید ہونے کا شرف حاصل ہے۔ مرید کو اسباق دے کر آپ لاہور تشریف لے آئے۔

نعمت اللہ سرہندی اسباق میں مشغول ہوگئے۔

روایت ہے کہ کچھ عرصے بعد ماورائی مناظر منکشف ہونے لگے۔ وہ انوار کا دباؤ برداشت نہ کرسکے اور سرہند میں مقیم ایک صاحب کے پاس پہنچے جن کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ ماورائی علم جانتے ہیں۔ ان سے کہا، محسوس ہوتا ہے کہ باطنی نگاہ کھلنے سے مجھ پر عالمِ ملکوت روشن ہوا ہے، اسی کیف میں گم رہتا ہوں۔

ان صاحب نے کہا، جو دنیا تم پر روشن ہوئی ہے، وہ جنات کی دنیا ہے، عالمِ ملکوت نہیں۔ کچھ دن اور یہ کیفیت رہی تو نقصان ہوگا۔

نعمت اللہ سرہندی شک میں پڑگئے اور اسباق پڑھنا چھوڑ دیئے۔ نتیجے میں ماورائی دنیا اوجھل ہوگئی اور وہ کیف جاتا رہا جو ذکر سے حاصل ہوا تھا۔ اداسی اور مایوسی کا غلبہ ہوگیا۔ مرشد سے ملاقات کے لئے لاہور آئے۔

حضرت میاں میرؒ نے دیکھتے ہی فرمایا، کہئے نعمت اللہ صاحب! کیا واقعہ پیش آیا ہے؟

مرید نے روداد بیان کی تو فرمایا، ہمارے ہوتے ہوئے کسی اور کے پاس کیوں گئے؟

نعمت اللہ سرہندی نادم ہوئے۔

انہوں نے فرمایا، ہم نے تمہاری خدمت کو دل سے قبول کیا مگر افسوس ہے کہ تم نے علم کے تحفے کی قدر نہیں کی۔ جس کے پاس گئے، اسے کیا خبر کہ عالمِ ملکوت کیا ہے؟ اس کی باتوں میں آکر شک میں پڑگئے۔

نجات کی ایک ہی صورت تھی کہ اللہ سے معافی

مانگیں۔ عرض کیا، اللہ کے حضور معافی مانگ کر کھویا ہوا کیف دوبارہ حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ یہ کہتے ہوئے آنکھیں پانی سے بھر گئیں۔

حضرت میاں میرؒ نے فرمایا، آج رات تنہائی میں بیٹھ کر خلوصِ دل سے اسمِ الٰہی پڑھو۔

نعمت اللہ سرہندی نے حکم کے مطابق عمل کیا اور صبح ہوتے ہی مرشد کی خدمت میں حاضر ہو کر زار و قطار رونے لگے اور عرض کیا، مراد کو پہنچا ہوں اور اس گھر کی زیارت سے بھی مشرف ہوا ہوں جہاں جانے کی خواہش دل میں تھی۔

دریافت کیا، اب کہاں جانا چاہتے ہو؟

عرض کیا، مرشد کے قدموں کے سوا کہیں نہیں کہ یہی وہ راستہ ہے جو مجھے صراط مستقیم پر قائم کرے گا۔

حضرت میاں میرؒ نے فرمایا، تنہائی صبر آزما اور احتیاط کی متقاضی ہے۔ ورد اور وظائف اسی لئے بتائے تھے کہ تمہیں تنہائی کا بہترین رفیق ملے اور تم بھٹکنے سے محفوظ رہو۔

(۳) حضرت میاں میرؒ لاہور کے محلے باغبان پورہ میں سکونت پذیر رہے اور معرفت کے سمندر سے لوگوں کو سیراب کیا۔ ایک مرتبہ فرمایا،

"جس کے دل میں طلبِ حق کی آگ روشن ہوتی ہے، اس کا جذبہ سرد نہیں پڑتا اور جو لالچ میں آتا ہے، وہ جلد یا بدیر چلا جاتا ہے۔"

زیادہ وقت خاموش رہتے۔ فرماتے تھے،

"بات چیت کم کیا کرو — زیادہ بولنے سے انسان ذکرِ الٰہی سے محروم رہ جاتا ہے۔"

ایک مرید شیخ عبدالواحد سے روایت ہے کہ شیخ باغ میں آرام کر رہے تھے کہ فاختہ اڑتی ہوئی آئی اور قریب درخت پر بیٹھ کر بولنے لگی۔

پیر و مرشد نے فرمایا، عبدالواحد! غور سے سنو کہ فاختہ کس شیرینی اور فصاحت کے ساتھ اپنے خالق کی تسبیح کر رہی ہے۔

میں نے غور سے سنا۔ باغ میں فاختہ کی آواز سے سماں بندھ گیا تھا۔ شیخ کی طرف دیکھا تو ان پر وجد طاری تھا۔ اتنے میں غلیل ہاتھ میں لئے ایک شکاری آیا اور فاختہ کا نشانہ لیا۔ فاختہ جو چند ثانیے پہلے تک رب کی تسبیح میں مشغول تھی، شکاری کی بے حسی کا شکار ہو گئی۔ شکاری اسے مردہ دیکھ کر چلا گیا۔

شیخ کو سخت اذیت پہنچی۔

فرمایا، عبدالواحد! پرندے کو اٹھا کر لاؤ۔

فاختہ کو ہاتھ میں لے کر چند لمحے دیکھتے رہے

پھر مردہ جسم پر ہاتھ پھیرتے ہوئے فرمایا، اللہ کے حکم سے زندہ ہو اور رب کی پاکی بیان کر!

الفاظ ادا ہوتے ہی فاختہ کے جسم میں حرکت ہوئی، وہ اڑ کر درخت کی شاخ پر جا بیٹھی اور دوبارہ سے ذکر کرنے لگی۔

اس کی آواز سن کر شکاری واپس آیا۔ حضرت میاں میرؒ نے اسے آتا دیکھ کر مرید سے فرمایا، سنگ دل شکاری سے کہہ دو کہ دوبارہ پرندے کو ضرر پہنچائی تو اچھا نہیں ہوگا۔

شکاری نے پیغام کو سنجیدہ نہیں لیا اور پوری طاقت سے غلیل کھینچی۔ اگلے لمحے دردناک چیخ فضا میں بلند ہوئی۔ پتھر پوری قوت سے شکاری کے انگوٹھے پر لگا تھا۔ وہ درد سے کراہ رہا تھا۔

شیخ نے فرمایا، یہ دوا سے ٹھیک ہونے والا درد نہیں۔ فقیر نے پہلے ہی تنبیہہ کر دی تھی لیکن کوئی خود ہی کنوئیں میں گرے تو اسے کون بچائے؟

شکاری نے درد سے نجات کی درخواست کی تو فرمایا، کیا تو بھوکا تھا جو پرندے کو شکار کر رہا تھا؟ شریعت نے شکار اس لئے جائز قرار دیا ہے کہ آدمی بھوک کے وقت کچھ اور میسر نہ ہو تو چرند پرند کو غذا بنا سکتا ہے۔ سیر و تفریح کے لئے اللہ کی مخلوق کا خون بہانا مناسب نہیں۔

اس نے شکار سے توبہ کی۔ انہوں نے فرمایا، اب اللہ بھی تجھے اذیت سے محفوظ رکھے گا۔

تاریخ کی کتب میں لکھا ہے کہ ایک بار شہر میں طاعون کی وبا پھیلی۔ گھر کے گھر ویران ہو گئے۔ ایک بزرگ نے آپ سے کہا، شیخ آئیں، ہم مل کر وبا ختم کرنے کی کوشش کریں۔

حضرت میاں میرؒ نے فرمایا، جب لوگوں کی قضا آجاتی ہے پھر کوئی دعا کارگر نہیں ہوتی۔

وہ بزرگ اکیلے ریاضت میں بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ ان پر بے ہوشی طاری ہو گئی اور وظیفہ جاری نہ رکھ سکے۔

حضرت میاں میرؒ عمر کے آخری ایام میں بیمار ہو گئے۔ حاکمِ شہر وزیر خان آپ کی علالت کا سن کر طبیب کو لے کر حاضر ہوا۔ آپ نے اس کی آمد کو پسند نہ فرمایا اور یہ کہہ کر معذرت کی کہ میرے لئے حکیمِ مطلق ہی کافی ہے۔

حضرت میاں میرؒ بیماری سے جانبر نہ ہو سکے اور خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

Canderel®
with Stevia
Naturally Sweet
Zero Calorie Sweetener
Canderel
Stevia
Available in
Tablets, Sachets and Jars
SEARLE

New Homes For Sale in Multan & Lahore

For More Details : +92 345 4121 910

عفت جبیں

یہ جو دیوانے سے دو چار نظر آتے ہیں

چار کا ہندسہ ریاضی میں چار ہے، ریاضی سے باہر اس کی حیثیت مختلف ہے جیسے محاورے کی دنیا میں جب آنکھیں چار ہوتی ہیں تو بہت ناچار ہوتی ہیں۔ سکون — بے سکون ہو جاتا ہے۔

بچہ گھر آیا تو منہ بسورتے ہوئے ماں سے بولا، میں کل سے اسکول نہیں جاؤں گا۔

امی نے پوچھا، کیوں بھئی، کیوں نہیں جاؤ گے ؟

اس نے کہا، پرسوں مس نے پڑھایا تھا کہ تین اور تین چھ ہوتے ہیں۔ کل بتایا کہ چار اور دو چھ ہوتے ہیں اور آج کہہ رہی تھیں کہ پانچ اور ایک چھ ہوتے ہیں۔ نہ جانے کل کیا کہیں۔ خود مس کو ہی نہیں پتہ کہ چھ کتنے ہوتے ہیں تو مجھے کیا پڑھائیں گی — ؟

امی نے کیا جواب دیا اور جواب دیا بھی یا نہیں، نہیں معلوم لیکن آپ سوچئے کہ جب اس دن کے بعد گھر میں دعوت ہوئی ہو اور گھر والوں نے کہا ہو کہ آج فلاں صاحب یا صاحبہ کے آنے سے دعوت کو چار چاند لگ گئے تو بچہ سوچتا رہ گیا ہو گا کہ ان کی گنتی تو مس کی گنتی سے زیادہ پریشان کن ہے۔ آسمان پر ایک چاند ہے، باقی تین چاند کہاں سے آئے ؟

اردو کی گنتی میں چار کا ہندسہ جب تک گنتی کی حد میں رہتا ہے، چار ہوتا ہے۔ گنتی سے باہر نکلتے ہی اسے پر لگ جاتے ہیں۔ خاص طور پر اردو محاوروں اور ضرب المثل میں چار کا لفظ موقع محل کی مناسبت سے کہیں زیادہ کو ظاہر کرتا ہے اور کہیں کم۔ جلیلؔ مانک پوری نے کہا ہے،

سچ ہے احسان کا بھی بوجھ بہت ہوتا ہے
چار پھولوں سے دبی جاتی ہے تربت میری

یہاں چار کا مطلب "چند" ہے۔ چار پھولوں سے دبی جاتی ہے تربت میری — پھول تو چند ہیں مگر ان کو قبر (جسم) پر رکھ کر وہ احسان کیا گیا ہے کہ میں ان کا بوجھ اٹھانے سے عاجز ہوں۔

شاعر جاں نثار اختؔر نے کہا ہے،

فرصتِ کار فقط چار گھڑی ہے یارو
یہ نہ سوچو کہ ابھی عمر پڑی ہے یارو

فرصت کا وقت تھوڑا ہے۔ زندگی کو طویل نہ سمجھو۔ یہ طویل نظر آتی ہے لیکن ہے مختصر۔

چار کا لفظ حساب میں کئی تراکیب کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ اکثر ایک جملہ بولا جاتا ہے،

چار لوگ سنیں گے تو کیا کہیں گے

یہاں چار لوگ سے مراد چار نہیں بلکہ یہ ہے کہ جتنے لوگ سنیں گے، وہ کیا کہیں گے؟

جب یہ جملہ اح م ق وں کے سامنے بولا جاتا ہے تو وہ حساب کتاب میں لگ جاتے ہیں کہ وہ چار لوگ کون ہیں جو سن رہے ہیں۔

چار بطور استعارہ بھی استعمال ہوتا ہے۔ استعارہ ایسے لفظ کو کہتے ہیں جو تشبیہ کے لئے خاص معنی میں بولا جاتا ہے جیسے راحتؔ اندوری کا یہ شعر،

تمہیں پتہ یہ چلے گھر کی راحتیں کیا ہیں
ہماری طرح اگر چار دن سفر میں رہو

چار دن کے سفر کی بات ہو تو کراچی سے ہنزہ براستہ سڑک جانے میں دو اور واپس آنے میں دو دن لگتے ہیں۔ راحتؔ اندوری صاحب نے چار دن کو کچھ دن یا کئی دن کے استعارے کے طور پر استعمال کیا ہے۔

برے وقت میں کام آئیں گے اکثر
رکھو گے اگر چار پیسے بچا کر

یہ عبدالاحد سازؔ کا شعر ہے۔ چار دن کی طرح چار پیسے بھی اتنی رقم کا جمع کرنا ہے جو مشکل میں کام آ سکے۔ آپ نے سنا ہوگا کہ عموماً لوگ پیسے بچانے کی بات کرتے ہیں تو اسے برے دنوں سے وابستہ کر دیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ پیسے بچا کر رکھو، برے دن آئے تو کیا کرو گے۔

بتایئے اگر برے وقت کے لئے پیسے بچا کر رکھے جائیں تو کیا یہ مصیبت یا ناگہانی کو دعوت دینا نہیں ہے کہ بھائی آؤ! ہم نے تم سے نبرد آزما ہونے کی تیاری کی ہوئی ہے ــــ؟

'چار کتابیں' بھی زبان زد عام ہے۔ کہتے ہیں کہ چار کتابیں کیا پڑھ لیں، ہمیں سکھانے آ گیا۔ مطلب کسی بات کا واجبی یا کم علم ہونا مگر خود کو افلاطون سمجھنا۔ ندؔا فاضلی نے لکھا ہے،

بچوں کے چھوٹے ہاتھوں کو چاند ستارے چھونے دو
چار کتابیں پڑھ کر یہ بھی ہم جیسے ہو جائیں گے

لفظ چار، سمتوں کے لئے تب بولا جاتا ہے جب

تمام سمتوں کی بات ہو۔ تحقیق و تلاش (سائنس) کے مطابق سمتیں چار ہیں اس لئے جب شے کا چاروں اطراف کے حوالے سے ذکر ہو تو لفظ چار خدمت کے لئے حاضر ہو جاتا ہے۔

وہ کہ خوشبو کی طرح پھیلا تھا میرے چار سو
میں اسے محسوس کر سکتا تھا، چھو سکتا نہ تھا

شعر میں عدیمؔ ہاشمی نے چار سُو کا لفظ محیط کے معنوں میں لکھا ہے کہ محبوب نظروں سے دور ہے لیکن وہ اس کی خوش بو کو اپنے چاروں طرف محسوس کر کے بھی چھو نہیں سکتے۔

عدد چار کے ساتھ اگر دن کا لفظ لگ جائے تو ان کے ملنے سے وقت کے ایسے ایسے استعارے بنتے ہیں کہ سوچ بچار ضروری ہو جاتی ہے۔

سیمابؔ اکبر آبادی کا شعر ہے،

عمرِ دراز مانگ کے لائی تھی چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے، دو انتظار میں

انور شعورؔ نے اس طرح بیان کیا ہے،

محبت رہی چار دن زندگی میں
رہا چار دن کا اثر زندگی بھر

پہلے مصرعے میں پوری زندگی چار دن کی رہی، دوسرے میں چار دنوں کا اثر پوری زندگی رہا یعنی زندگی چار دنوں سے زیادہ تھی۔

مضمون کے شروع میں جس بچے کا ذکر ہے، جب وہ پڑھے گا کہ ہندسہ چار سے کیا کچھ بن گیا ہے تو ممکن ہے کہ وہ تین جمع تین، پانچ جمع ایک اور چار جمع دو بھول جائے۔

چار کا ہندسہ گنتی میں چار ہے۔ محاورے کی دنیا میں جب آنکھیں چار ہوتی ہیں تو بہت ناچار ہوتی ہیں۔ سکون ـــ بے سکون ہو جاتا ہے۔

ریاضی سے باہر کی دنیا میں چار وہ نہیں ہے جو ریاضی کی دنیا میں ہے۔ جیسے محاورے میں چار چاند روشنی کی مقدار کا استعارہ ہے نا کہ چاند کی تعداد کا۔ چار چاند لگنے کی وجہِ تسمیہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ جس نے اردو زبان کو یہ محاورہ دیا، اسے لفظ چار پسند تھا ورنہ وہ دو اور تین چاند پر تکیہ کر سکتا تھا ـــ اس کی دیکھا دیکھی باقی لوگ قول میں تبدیلی کرتے اور چار کی جگہ ایک، دو، تین کہہ دیتے۔ پھر تین دن کی چاندنی، چہار سو کی جگہ ایک سُو، دو لوگ سنیں گے تو کیا کہیں گے، تین حرف وغیرہ جیسے محاورے اور ضرب المثل وجود میں آتیں۔ ہوا یہ کہ جس نے پہلے چار نمبر کی گاڑی پکڑی، پیچھے آنے والے لوگ اسی گاڑی میں سوار ہوتے گئے۔

یہ تو آپ کو معلوم ہو گیا کہ چار کا مطلب چار نہیں ۔۔۔ پانچ چھ سات بھی ہے۔ زبان دان کہتے ہیں کہ معنی و مفہوم دیکھے جاتے ہیں کہ بات چار کے ہندسے کی ہے یا چار بطور استعارے کی۔

یہی صورت محاوروں کے ساتھ ہے۔ خیالی پلاؤ ہر شخص پکا سکتا ہے لیکن اصلی پلاؤ پکانے کے لئے مشق اور مہارت چاہئے۔ سات سمندر پار کر کے کوئی نہیں جا سکتا کیوں کہ سارے سمندر ایک صف میں نہیں، درمیان میں خشک خطے آتے جاتے ہیں۔ اردو میں سات سمندر پار سے مراد یورپ یا امریکا ہے حالاں کہ پاکستان سے یورپ تک براستہ سڑک جا سکتے ہیں۔

غصہ ناک پر ہونا اسی طرز کا ایک محاورہ ہے۔ ناک پر مکھی، مچھر یا چشمہ ہوتا ہے، غصہ دماغ کے اندر ایک حرکت ہے۔ غصہ ناک پر ہونے کا مطلب بات بات پر غصے کی عادت ہے۔ لفظ چار کی طرح اس قسم کے محاورے بات کو بیان کرنے کے پیرائے ہیں۔

چار کا استعمال مرزا غالبؔ نے بھی کیا ہے،

حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالبؔ
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

ساغرؔ صدیقی کے اشعار مضمون میں شامل نہ

ابدالِ حق حضور قلندر بابا اولیاؒ فرماتے ہیں

اچھی ہے بری ہے دہر فریاد نہ کر
جو کچھ کہ گزر گیا اسے یاد نہ کر
دو چار نفس عمر ملی ہے تجھ کو
دو چار نفس عمر کو برباد نہ کر

ہوں تو بات ادھوری رہ جائے گی۔

یہ جو دیوانے سے دو چار نظر آتے ہیں
ان میں کچھ صاحبِ اسرار نظر آتے ہیں
تیری محفل کا بھرم رکھتے ہیں سو جاتے ہیں
ورنہ یہ لوگ تو بیدار نظر آتے ہیں

اب چار کا ایک اور استعمال پڑھئے جو شاعر مشرق حضرت علامہ اقبالؒ نے کیا،

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

مسلمان کے معنی سلامتی کے دائرے میں داخل ہونا ہے۔ سلامتی صرف اللہ کے حکم کی تعمیل اور خاتم النبیین حضور پاکؐ کی اطاعت میں ہے۔ شاعر نے کہا ہے،

زندگی کہتے ہیں جس کو چار دن کی بات ہے
بس ہمیشہ رہنے والی اک خدا کی ذات ہے

عرفانہ شہزاد

کِس نے سنا

اندر کی دنیا میں تفکر کے دوران بے چینی طاری ہوئی۔ کسی پل قرار نہ آیا تو میں حضرت ابوالفیض قلندر علی سہروردیؒ کے مزار پہ حاضر ہوئی اور "تصورِ شیخ" کا مراقبہ کیا۔ تصور میں گہرائی پیدا ہوتے ہی ماورائی آوازیں سماعت بنیں۔ نہ جانے کون کون لحن کے ساتھ ورد کر رہا تھا.....

قدرت نے مشاہدۂ حق کے لئے مخلوق کے قلب میں نور داخل کیا۔ کسی مقام کو زمین اور کسی کو آسمان قرار دیا۔ آسمان کو بروج سے سجایا اور زمین کو آئینہ بنایا۔ دونوں میں چراغ رکھے اور گداز کی لَو روشن کی۔ لَو کے بھڑکنے سے دن اور گھٹنے سے رات ہوئی۔ دن کی طوالت کو شب کا وصل ملا تو حیات رخِ یار سے فروزاں ہوگئی۔

مشاہدۂ حق کے لئے ذہن کو ایک مرکز کا پابند ہونا ضروری ہے۔ پھر انکشاف ہوتا ہے کہ قلبِ مخمور* کے لئے ہر ذرّہ آئینہ ہے۔

شاعر نے کہا ہے،

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

اہلِ دل سے کوئی پوچھے کہ آہِ نارسا سے شبِ مراد تک پہنچنے کے لئے کتنے برس وحشت کے صحرا کی خاک چھاننی پڑتی ہے۔ یہ راستہ پھولوں کی گزرگاہوں پر چل کر طے نہیں ہوتا۔ پھولوں میں بھی کانٹے ہوتے ہیں — جب بندہ ذہن میں موجود پھولوں سے بے نیاز ہو جاتا ہے تو کانٹے اس کے لئے نرم ہو جاتے ہیں۔ حسابِ عمر کا خلاصہ یہ ہے کہ عالمِ اسباب میں ذہن جس خیال میں سفر کرتا ہے — عالمین کے سفر میں وہی خیال اس کا ہم سفر بن جاتا ہے۔

ایمان بالغیب بندے کو اللہ کی طرف لے جاتا ہے جب کہ شک اللہ سے دوری ہے۔ حواس ایک ہیں۔ جب ان کے ذریعے اللہ سے رجوع

---

* قلبِ مخمور (خوشی سے سرشار ہونا)

کیا جاتا ہے تو یقین کی دنیا روشن ہوتی ہے اور جب حواس کو ظاہری چمک دمک تک محدود کر دیا جائے تو یہ الوژن ہیں۔ تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ جب اللہ سے محبت کا احساس مغلوب ہوتا ہے تو زندگی کفرانِ نعمت بن جاتی ہے۔ دوسری جانب اگر بُعد (دوری) رجحانات کو نظر انداز کر دیا جائے تو مشاہدے کی قوت بیدار ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں خاتم النبیین حضور پاکؐ سے فرمایا ہے کہ ہر نبی اور رسول ان حالات سے گزرے ہیں کہ جب ان کے دل میں کوئی آرزو پیدا ہوئی تو شیطان نے وسوسہ ڈالنے کی کوشش کی۔ اللہ تعالیٰ نے وسوسے کو دور کر کے ان کے دل میں اپنی باتیں ڈالیں جو پیغمبران کرام علیہم السلام کا یقین بن گئیں۔

ہر میں کے تشخص کی بنیاد خالقِ کائنات اللہ ہے۔ شعور جب میں کو بنیاد سے الگ دیکھتا ہے تو دیوار بن جاتی ہے۔ میں مفروضہ ہے جس سے محفوظ رہنے والا شخص ذات کو پہچان لیتا ہے۔

راہ نما سے عرض کیا کہ پڑھنے، لکھنے اور سننے میں یہ بات آتی ہے کہ فلاں شخص نے سو سال ریاضت کی لیکن عرفان نصیب نہ ہوا۔ یہ بات مایوسی پیدا کرتی ہے۔ کیا اس میں صداقت ہے؟

انہوں نے ارشاد فرمایا،

"اس کی ریاضت کا مقصد اللہ نہیں تھا۔ یہ ممکن نہیں کہ کسی شخص کو اللہ کی طلب ہو اور اللہ اسے نہ ملے۔"

ایک موقع پر ہم سے فرمایا،

"اصل ہی اصل کو دیکھ سکتی ہے۔ کیا کبھی نقل نے بھی اصل کو دیکھا ہے؟ اگر آپ یہ نکتہ سمجھ جائیں تو اصل مشاہدہ بن جاتی ہے۔"

مجلسِ عرفان جاری تھی کہ کسی نے گلوگیر لہجے میں عرض کیا، اللہ تعالیٰ یاد آتے ہیں۔

صاحبِ یقین بزرگ نے فرمایا،

"اللہ اور بندے کا معاملہ دو طرفہ ہے۔"

یہ فرما کر وہ خاموش ہو گئے۔

سمجھنے والوں پر روشن ہوا کہ بندہ سمجھتا ہے کہ وہ اللہ سے محبت کرتا ہے جب کہ خالق کے سامنے بندے کی حیثیت نہیں۔ خالق خود مخلوق سے محبت کرتا ہے اسی لئے مخلوق کے قلب میں ذات سے رجوع کی کشش پیدا ہوتی ہے۔

شعور آئینہ ہے۔ کہیں سے روشنی آتی ہے اور آئینے پر منعکس ہوتی ہے تو آئینے پر عکس الٹا بنتا

ہے۔ ایک آئینہ اندر بھی ہے۔ اس میں نصب شیشہ عکس کو ویسا دکھاتا ہے جیسا وہ ہے۔ راہ نما شاگرد کو تربیت سے گزار کر بیرونی آئینہ توڑ دیتے ہیں تاکہ شاگرد باہر دیکھنے میں بھی اپنے اندر میں دیکھے۔

مشاہدۂ حق کا مطلب سچائی سے آگاہی ہے۔ آدمی، آدمی کی دوا ہے لیکن اپنی طرح مجبورِ محض شخص کو توقعات کا محور بنانا دراصل سچائی کی نفی کرکے مفروضے سے وابستہ ہونا ہے۔ لوگوں سے تعلق مدد کرنے کی حد تک رکھئے، بدلے میں مدد کا خواہاں رہنے کے لئے نہیں — بے ساکھیاں آدمی کو کمزور کرتی ہیں جب کہ نیاز مندی سے یقین کی قوت منتقل ہوتی ہے۔

ہر فرد کو ظرف اور سکت کے مطابق مشاہدہ ہوتا ہے۔ ایک روز بزرگ راہ نما نے فرمایا،

"سب جانتے ہیں کہ بادشاہ کے پاس ہیرے ہیں لیکن بادشاہ ہیروں کی نمائش نہیں کرتا۔"

روحانیت کو علمِ سینہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا ہے — علم کی حفاظت کی جاتی ہے۔ غور طلب ہے کہ شیطان آسمانی دنیا میں فرشتوں کی گفتگو سننے جاتے ہیں تو ان پہ شہاب پھینکے جاتے ہیں تاکہ وہ رموز سے واقف نہ ہوں اور ملائکہ کی انسپائریشن کے پروگرام میں بگاڑ پیدا کرکے اہلِ زمین کے لئے پریشانی کا باعث نہ بنیں۔ شیطان کی پہچان وسوسہ ہے جس کے ذریعے وہ قلب میں داخل ہونے کا راستہ تلاش کرتا ہے۔ وسوسہ آئے تو سمجھ جایئے کہ شیطان قلب میں داخل ہونے کی راہ چاہتا ہے۔

حقیقت کا مشاہدہ دو طرح سے ہوتا ہے۔

۱۔ صفات کا مشاہدہ

۲۔ ذات کا مشاہدہ

منزل رسیدہ استاد کی نسبت کے بغیر ذات و صفات کا مشاہدہ نہیں ہوتا ورنہ راہِ سلوک کا مسافر نظر کے فریب کو حقیقت سمجھ کر راہ سے بھٹک جاتا ہے۔

بزرگ راہ نما کی ہر بات میں پیغمبران کرام علیہم السلام اور خاتم النبیین حضرت محمدؐ کی تعلیمات کا حوالہ اور تشریح ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ دنیا میں رائج تمام ظاہری و باطنی علوم کا ماخذ الہامی علوم ہیں اور یہ کہ قرآن کریم کو سمجھے بغیر آدمی کائنات سے واقف نہیں ہو سکتا۔

"ہم نے قرآن کا سمجھنا آسان کردیا۔ ہے کوئی سمجھنے والا؟" (القمر: ۱۷)

ایک بہن نے اس حکم پر عمل کیا اور ہمیں اپنی کیفیات کے بارے میں بتایا۔ وہ کہتی ہیں،

"میں نے ہدایت کے مطابق قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر یعنی سمجھ کر پڑھنے کی کوشش کی تو تین روز تک قلب میں نورانی بارش محسوس کی۔ اس دوران ذہن اللہ کی طرف یکسو رہا۔ کبھی رقّت طاری ہوتی اور کبھی بھاری پن محسوس ہوتا۔ اس کیفیت سے میرے اندر قرآن کریم کو پڑھنے کا ذوق بڑھ گیا ہے اور قرآن فہمی کی طرز بدل گئی ہے۔ الحمدللہ! تفکر میں گہرائی پیدا ہوگئی ہے۔"

آسمانی کتابیں اور قرآن کریم خالقِ کائنات اللہ تعالیٰ کی صفتِ کلام کا مظہر ہیں۔

راہ نما فرماتے ہیں،

"قرآن کریم ایسے پڑھو کہ اللہ تم سے ہم کلام ہے۔ یکسو ہو کر سمجھنے کی کوشش کرو — ذہنی اور قلبی ربط قائم ہو جائے گا، انشاءاللہ۔"

ایک صاحبہ کا مہلک بیماری کے تلخ تجربے سے گزر کر اللہ پر یقین کس طرح مستحکم ہوا، یہ رُوداد ان کی زبانی سنیے۔

"میرے سینے میں گلٹیاں تھیں۔ ڈاکٹر نے کہا کہ سرجری سے ختم ہو جائیں گی۔ سرجری کے وقت میں نے گھر والوں اور دوست احباب سے کہا کہ کوئی میرے ساتھ اسپتال چلے لیکن سب نے کوئی نہ کوئی مجبوری بیان کر کے معذرت کرلی۔ میں دکھ اور تکلیف کی حالت میں اکیلے اسپتال روانہ ہوئی۔ وہاں کسی خاتون کے استفسار پر کہ آپ اکیلی کیوں ہیں، کیا آپ کے ساتھ گھر سے کوئی نہیں آیا، میں نے کہا — میں اکیلی نہیں ہوں، میرے ساتھ اللہ ہے۔ یہ سن کر خاتون کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ بولیں، جب تک آپ کا آپریشن نہیں ہوتا اور گھر واپس نہیں جاتیں — میرا بیٹا آپ کے ساتھ رہے گا۔

آپریشن تھیٹر میں مجھ پر بے چینی طاری ہوگئی۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ دل سے آواز آئی

اللہ نور السمٰوٰت والارض

اس کے ساتھ ہی نگاہ کے سامنے خانہ کعبہ کا منظر روشن ہوا۔ دیکھا کہ فیروزی روشنی کے بڑے بڑے دائرے نکل کر میری جانب آرہے ہیں۔ اس دوران میں ڈاکٹر نے میرے بارے میں کسی سے کہا کہ اس مریضہ کے تاثرات عام مریضوں سے مختلف ہیں۔ کچھ دیر بعد نگاہوں کے سامنے روضہ رسولؐ کا منظر روشن ہوا۔ دیکھا کہ نورانی ہالے نے مجھے حصار میں لیا ہوا تھا۔

ان مشاہدات کے بعد اللہ تعالیٰ پر یقین راسخ ہو گیا اور اللہ کے فضل سے مشکل وقت میں کبھی اکیلے پن کا احساس نہیں ہوا۔"

خاتون کی کیفیات سن کر میرے دل میں گداز پیدا ہوا اور اپنے محسن کی بات یاد آئی۔

"جب بندہ اللہ کی راہ پر چلتا ہے تو دنیا سے توقعات ٹوٹ جاتی ہیں اور اللہ پر یقین مستحکم ہو جاتا ہے۔"

مضمون لکھنے کے دوران مجھ پر بے چینی طاری ہوئی۔ کسی پل قرار نہ آیا تو میں حضرت ابوالفیض قلندر علی سہروردیؒ کے مزار پہ حاضر ہوئی اور "تصورِ شیخ" کا مراقبہ کیا۔ تصور میں گہرائی پیدا ہوتے ہی ماورائی آوازیں سماعت بنیں۔ نہ جانے کون کون لحن کے ساتھ ورد کر رہا تھا،

یا اللہ یا رحمٰن یا رحیم
یا اللہ یا رحمٰن یا رحیم
یا اللہ یا رحمٰن یا رحیم

اپنے وجود کو لہروں میں تحلیل ہو کر اس ورد کی بازگشت بنتے دیکھا۔ پھر اندر میں اپنا دل نظر آیا، سفیدی مائل نیلگوں اور مرجھایا ہوا۔ ورد کی تکرار جاری تھی کہ ایک بہت محترم ہستی کی نسبت عطا ہوئی اور پژمردہ دل میں توانائی کی

صید ہوں روزِ ازل سے عالم اسباب کا
اور وا رکھتا ہوں سینے میں دریچہ خواب کا
سامنے آتے ہی اس کے میری وحشت جاگ اٹھی
دھیان رہتا تھا مجھے یوں تو بہت آداب کا
کارزارِ عشق سے باہر نکل کر دیکھیے
ساری بستی میں اجالا ہے اسی کم یاب کا
عالمِ رویا میں دیکھا تھا جسے میں نے کبھی
عکس ہے اب میری آنکھوں میں اسی محراب کا
آگیا آخر کتابِ عشق کا انجام بھی
دور تک بکھرا ہوا منظر ہے پہلے باب کا
شام ہے اور سرخ پیڑوں کے دہکتے سائے بھی
نیند میں بہتا ہوا دھارا ہے جوئے آب کا
کس لئے ساجدؔ بناتا ہوں گھروندے ریت کے
رخ بدل سکتا ہے تھوڑی دیر میں سیلاب کا
(شاعر: غلام حسین ساجدؔ)

لہر دوڑ گئی۔ اب دل سونے کی طشتری میں تھا، اس کے اردگرد گلاب کی پتیاں تھیں۔ پھر اس میں سے تازہ خون پھوٹ پڑا۔ ایسی رقّت طاری ہوئی کہ لگتا تھا آنسوؤں میں بہہ جاؤں گی۔ اس کے بعد بے قراری کو قرار آ گیا۔

اقتباسات

"ماہنامہ قلندر شعور" کو گلدستہ بنانے کے لئے قارئین کی کوشش قابلِ قدر ہے۔ قرآن کریم، آسمانی کتابوں، ملفوظات، تاریخ، انکشافات اور سائنسی فارمولے بھیج کر اس رسالے کا حصہ بن سکتے ہیں۔ تحریر کم و بیش 120 الفاظ پر مشتمل ہو۔

خانہ کعبہ کے اوپر ہر وقت انوار و تجلیات کا نزول ہوتا ہے۔ خانہ کعبہ کا سیاہ رنگ پردہ ان انوار کو اپنے اندر ذخیرہ کرتا ہے اور احرام کا سفید رنگ حاجی پر انوار کی لہروں کو منعکس کرتا ہے جس کی وجہ سے زائر کا دماغ اور جسمِ مثالی انوار سے روشن اور مزین ہو جاتا ہے۔ سفید رنگ کا لباس ذہنوں میں پاکیزگی کا احساس پیدا کرتا ہے جس سے حواس لطیف ہو جاتے ہیں۔ بندہ بشر لطیف حواس سے عالمِ بالا کی طرف صعود کرتا ہے اور اس کا رجحان اللہ کی طرف ہو جاتا ہے۔ عبادت اور رجوعِ الٰہی سے روح کی نگاہ غیب کا مشاہدہ کرتی ہے۔ لباس کی یکسانیت ذہنوں میں ہم آہنگی پیدا کرتی ہے۔ (مرسلہ: مختار علی۔ سکھر، کتاب: روحانی حج وعمرہ)

انسان کا سب سے اہم اور ارفع کام انسانیت کی خدمت ہے اور یہ اس طرح ممکن ہے کہ انسان کو مقصدِ حیات سے روشناس کر کے اس کی اخلاقی قوتوں کو بیدار کر دیا جائے یہاں تک کہ فقر میں اس کو فخر محسوس ہونے لگے۔ انسانی فطرت سکون کی متلاشی ہے۔ مادی وسائل کی جدوجہد جتنی بڑھتی ہے، اتنا ہی سکون ختم ہوتا ہے اور بے چینی میں اضافہ ہوتا ہے۔ بدبختی یہ ہے کہ جو چیز سکون اور اطمینان کو برباد کرتی ہے، آدمی اس کے حصول میں اپنے مرض کا علاج تلاش کرتا ہے اور زہر کو تریاق سمجھ کر پیتا ہے۔ حقیقی اطمینان اور خوشی کا سرچشمہ ذاتِ باری تعالیٰ ہے۔ (مرسلہ: حفصہ طارق، کینیڈا، کتاب: تاریخِ مشائخِ چشت۔ جلد اول)

ساقی رہا نہ وہ زمانہ رہا

لکھنؤ کی ایک پہچان نوابوں کے پکوان ہیں۔ مرزا جعفر حسین نے کتاب "لکھنؤ کا دسترخوان" میں اپنے تجربات اور معتبر ذرائع سے حاصل شدہ معلومات کی روشنی میں نوابی کھانوں کی تراکیب اور کھانے کے طور طریق دلچسپ انداز میں بیان کئے ہیں۔ کھانوں کی تراکیب تقریباً 100 سال یا اس سے پرانی ہیں۔ ماہنامہ قلندر شعور کے قارئین کے لئے یہ مضمون بطور تحفہ قسط وار شائع کیا جارہا ہے۔

کھانے کے اختتام پر شیریں غذائیں کھانا دستور میں داخل تھا جس کو منہ میٹھا کرنا کہتے تھے۔ بعض روٗسا بہتات کے ساتھ میٹھی غذائیں استعمال کرکے دو تین لقمے کسی لذیذ نمکین اور چٹ پٹی چیز کے مثلاً کباب یا پسندوں کے کھاتے لیکن قدیم لکھنؤ کے پرانے وضع دار منہ میٹھا کرنے کے بعد نمکین کرنے کے قائل نہیں تھے۔

مرزا محمد عسکری ادیب فرمایا کرتے تھے،

"میٹھا کھا کر اگر کوئی نمکین چیز کھالیتا ہے تو اس کا معدہ فریاد کرتا ہے کہ کیوں کوڑا جھونکا جارہا ہے؟"

ترکاریاں قریب قریب ہر گھر میں سادہ پکتی تھیں — موسمِ سرما میں قیمے کے ساتھ مٹر کے دانے یا سیم کے بیج شامل کر دیئے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ شب دیگ رئیس و غریب سب کی پسندیدہ غذا تھی۔ جو مفلوک الحال گھر میں شب دیگ نہیں پکواسکتے تھے، ان کی تواضع امرا اور محلے والوں کے یہاں ہو جاتی تھی۔

دونوں وقت کے کھانے کے علاوہ ناشتے پر بھی ہر ایک کو توجہ رہتی تھی۔ کم حیثیت کے لوگ زیادہ تر بازار کی چیزوں سے ناشتا کرتے تھے۔ چند پیسوں میں گھر بھر کی ضرورت پوری ہو جاتی اور کام و دہن کو ذائقہ بھی مل جاتا تھا۔ روٗسا گرمیوں میں عام طور سے پوریاں، انڈوں کے خاگینے، مربّے، حلوے اور بالائی نوش فرماتے تھے۔ جاڑوں میں کسی ایک قسم کی نان،

انڈوں کے خاگینے، جوزی[1] حلوہ سوہن یا پپڑی اور بالائی کا ناشتا ہوتا تھا۔

بالائی لکھنؤ والوں کو ہمیشہ مرغوب رہی ہے۔ رئیسوں کے یہاں ہر روز ناشتے پر بالائی ہونا ضروری تھا۔ یہ عرض کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ یہ چیز قدیم وقت سے رائج تھی اور ملائی کہلاتی تھی۔ آصف الدولہ کو ملائی بہت پسند تھی اور ان کے لئے اہتمام سے تیار کی جاتی تھی۔ انہوں نے اس کا نام بالائی رکھ دیا جو اس وقت سے رائج ہو گیا اور اب بھی خواص و عوام کی زبان زد ہے۔

گزشتہ لکھنؤ کی بالائی اپنی آپ مثال تھی۔ دودھ کو پکایا اور کھپایا جاتا تھا۔ اس پر سے پرتوں کی پرتیں اتار کر اس طرح تہ بہ تہ جمائی جاتی تھیں کہ دودھ کی تری کا شائبہ باقی نہ رہتا تھا۔

فارغ البالی و خوشحالی اور ارزانی کے زمانے میں قدیم لکھنؤ کے باشندوں کے لئے نفاست و نزاکت اور رنگینی و تنوّع سے زندگی کو سنوارنا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ ان کے مذاق و مزاج میں فن کارانہ صلاحیتیں بس گئی تھیں۔ غذاؤں پر خصوصیت کے ساتھ توجہ تھی اس لئے ہر رئیس ایجادات و اختراعات کے پہلو نکال لیتا تھا۔

ان ہی رئیسوں کی سرپرستی کی بدولت بہترین باورچی سامنے آتے تھے۔ سماج کچھ اس طرح تعمیر تھا کہ جو ایجاد کسی رئیس کے یہاں ہوتی تھی وہ جلد یا بدیر بازار تک پہنچ کر عوام کی ملکیت بن جاتی تھی۔

شاہی زمانے میں باورچیوں سے محیرّ العقول[2] کارناموں کے مظاہرے ہوتے تھے۔ آصف الدولہ کے باورچی نے خفا ہو کر اپنے مخصوص طرز کی پکائی ہوئی ماش کی دال سوکھے درخت کی جڑ کے نزدیک پھینک دی، وہ درخت تین یا چار روز کے بعد ہرا ہو گیا۔ سعادت علی خاں کا باورچی سادہ چاولوں کی ایسی گلتّھی[3] پکاتا تھا کہ کھانے والا اس کے ذائقے پر فریفتہ[4] ہو جاتا۔ غازی الدین حیدر کے باورچی کا پراٹھے پکانے میں کوئی جواب پیدا نہیں ہوا۔ ناصرالدین حیدر کے زمانے میں ایک باورچی بادام اور پستے اس نزاکت سے کترتا کہ چاول اور ماش کی دال کی ہو بہ ہو صورت ہو جاتے۔ کترے ہوئے بادام اور پستوں سے وہ کھچڑی تیار کرتا تھا جو ماش کی دال کی کھچڑی کہلاتی اور نظر آتی تھی۔

آخری دور میں نواب واجد علی شاہ کے دستر خوان پر ایک ظرف[5] میں مربّے پر نواب سلیمان

کو قورمے کا دھوکا ہو گیا۔ نواب موصوف بڑے صاحبِ ذوق تھے، ان کے یہاں اعلیٰ درجے کے ہنر مند باورچی ملازم تھے۔ انہوں نے بادشاہ کو کھانے کی دعوت دی۔ اس دستر خوان پر تمام غذائیں شیریں تھیں یہاں تک کہ دستر خوان، ظروف اور سلفچی[٦] تک شکر سے تیار کی گئی تھی۔

اس زمانے تک اچھا پکانے اور اچھا کھانے کا چلن برقرار تھا۔ چناں چہ اس صدی کی دوسری دہائی میں میرے محترم دوست مرزا بہادر مرزا محمد صادق علی خاں کے باورچی نے چند گھنٹوں کے اندر اپنے آقا کے ارشاد کی تعمیل کرتے ہوئے تیئس (23) قسموں کی کھچڑیاں اور بتّیس (32) طرز کی چٹنیاں دستر خوان پر حاضر کر دی تھیں۔ کچھ مدت کے بعد ہوتے ہوتے زمانہ ایسا بدلا کہ نہ وہ رئیس رہے اور نہ اب ان ہنر مند باورچیوں کا نشان باقی ہے جب کہ کھانا پکانے کا خام مال موجود ہے۔

ایک وقت اور قلیل وقفے میں بہت سی نمکین اور شیریں غذائیں ایک ساتھ تیار کر کے دستر خوانوں پر حاضر کرنے کے لئے باورچی خانوں میں پورے عملے کی ضرورت پڑتی تھی چناں چہ باورچی خانہ محکموں میں تقسیم رہتا تھا اور ان سب محکموں کا نگراں ایک فنکار شخص ہوتا جو داروغہ باورچی خانہ کہلاتا تھا۔ مودی خانہ[٧] اس کی ذمہ داری میں رہتا تھا اور تمام اجناس و اشیائے ضروری کی خریداری و فراہمی اُسی کے حوالے ہوتی تھی۔ فرائض میں پخت[٨] نگرانی، غذاؤں کے اجزائے ترکیبی کے صحیح استعمال کی جانچ اور بعد تیاری ظروف میں غذاؤں کی مطبخ سے دستر خوان تک روانگی نیز بہت سے امورِ متعلقہ شامل ہوتے تھے۔ رئیسوں کے یہاں داروغہ باورچی خانہ سب سے ذمہ دار اور مصروف عہدہ دار ہوتا تھا۔ اس کے ماتحت کام کرنے والوں کی تعداد کثیر ہوتی تھی اور ان خدمت گزاروں کی علیحدہ علیحدہ ٹولیاں تھیں جو تقسیمِ کار کے اصول پر اپنے اپنے فرائض انجام دیتی تھیں۔

دیگچی: باورچیوں، رِکاب داروں[٩] اور روٹی پکانے والوں کے علاوہ کچھ لوگ برتنوں کو مانجھنے پر مامور ہوتے جو دیگچی کہے جاتے تھے۔

کار پرداز: دوسری ٹولی ان فرماں برداروں کی تھی جو غذاؤں کے ظروف سے بھرے ہوئے خوان سروں پر رکھ کر مطبخ سے دستر خوان تک پہنچاتے تھے۔ یہ کار پرداز کہلاتے تھے۔ کھانے کے ظروف صاف کر کے ٹھکانے پر

محفوظ کرنا بھی ان کے حوالے تھا۔

خدمت گزار: تیسری ٹولی ان ملازموں کی تھی جو کھانا کھلانے سے متعلق جملہ خدمات انجام دیتے تھے۔ ان کا شمار خدمت گزاروں میں ہوتا تھا۔ پکانے والوں میں ہر رئیس کے یہاں کم سے کم دو افراد چپاتیاں، پوریاں اور پراٹھے پکانے والے تھے۔ ان میں ایک تنور کا ذمہ دار ہوتا اور روٹیاں یا پراٹھے پکاتا تھا۔

رِکاب دار: دوسرے کھانے پکانے کے واسطے باورچی اور رِکاب دار ملازم ہوتے تھے۔ باورچی بڑی مقدار والی غذائیں دیگوں، پتیلیوں یا بڑی بڑی پتیلیوں میں پکاتے تھے۔ رِکاب داروں کے ذمہ خاصگی[10] غذاؤں کی مخصوص پخت ہوتی تھی۔ یہ لوگ چھوٹی پتیلیوں کے کھانے پکاتے یا شیریں غذائیں تیار کرتے تھے۔

زنانہ باورچی خانوں میں دیگوں اور پتیلیوں کے چڑھنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ وہاں باورچنیں پتیلیوں میں کھانا پکاتی تھیں جس کی نگرانی بیگمات بہ ذاتِ خود فرماتی تھیں یا کسی عزیز ملازمہ کو اس کام پر تعینات کر دیتی تھیں۔

عہدِ قدیم کے باورچی پشتوں سے یہی پیشہ اختیار کئے ہوئے تھے۔ بہت سے مستقل طور پر ملازم تھے، دوسرے اجرت پر کام کرتے تھے لیکن ان کو شہر میں اتنا کام ملتا رہتا تھا کہ زندگی آرام سے بسر ہوتی تھی۔ یہ لوگ محلہ باورچی ٹولہ، پل غلام حسین چوک میں آباد تھے۔ کسی تقریب میں اجرت پر کہیں بلائے جاتے تو سج دھج سے عمدہ لباس پہن کر جایا کرتے تھے۔ چوک کے باورچیوں کی آخری یادگار جو زعفرانی پراٹھے اور شاہی قوامی ٹکڑے میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے، میرے یہاں ایک تقریب میں جامہ وار[11] باورچی اچکن[12] پہن کر آئے تھے۔

رئیسوں کی محفل کے اجڑ جانے کے بعد ان فن کاروں کی گرم بازاری بھی سرد ہوگئی، رِکاب داروں کا خاندان دریا پار حسن گنج میں آباد تھا۔ ان میں کچھ مستقل طور پر رؤسا کے یہاں ملازم تھے، بیسویں صدی کی ابتدا میں انہوں نے دوسرے عزیزوں کی طرح نجی تجارت کا پیشہ اختیار کر لیا۔ انہوں نے برفیاں، حلوے، چٹنیاں اور مربّے بنا کر فروخت کئے لیکن ان کی تیار کردہ اشیا بازاروں میں فروخت نہیں ہوتی تھیں۔ ہر رِکاب دار، رؤسا کے دو تین گھرانوں سے وابستہ تھا اور اس کی تمام مصنوعات ان ہی خاندانوں میں فروخت ہو جاتی تھیں۔ ان لوگوں کے اٹھ

جانے کے بعد جوزی حلوہ سوہن، پپڑی، انڈوں کا حلوہ، نورتن چٹنی اور مربّہ جات کے تمام ذائقے یک لخت معدوم ہیں۔

ہمارے خاندان کا رِکاب دار برکت علی ہجرت کر کے حیدر آباد دکن چلا گیا۔ 1939ء میں میرا وہاں جانا ہوا تو ایک دکان کے بڑے سائن بورڈ پر نظر پڑ گئی جس پر جلی لفظوں میں لکھا تھا، ''شاہانِ اَوَدھ کے دربار کا حلوائی۔''

میں نے بے ساختہ دکان میں قدم رکھا تو اندر تخت پر میاں برکت علی گاؤ کا سہارا لئے ایرانی قالین پر متمکن تھے اور سامنے نہایت خوب صورت سَٹک[۱۳] لگی تھی۔ وہ حقے کے دَم لگا رہے تھے، مجھے دیکھ کر کھڑے ہو گئے اور احترام کے ساتھ آؤ بھگت کی۔ حال دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ انہوں نے حیدر آباد میں آکر دکان کھولی تھی لیکن ایک مدت تک کامیابی نہیں ہوئی۔ اتفاقاً ایک روز اسی سائن بورڈ نے حضور نظام کو متوجہ کر لیا — اعلیٰ حضرت بہ نفسِ نفیس دکان کے اندر آ گئے، حسنِ اتفاق سے تازہ برفی موجود تھی، پسند فرمائی اور اپنی سرپرستی سے دکان کو خلعتِ امتیاز[۱۴] مرحمت فرمایا۔ اس کی بدولت کاروبار میں ترقی ہوئی جس میں روز افزوں اضافہ تھا — لیکن خوش حالی، فارغ البالی اور ظاہری شان و شوکت کے باوصف میاں برکت علی کو سکونِ قلب و دماغ حاصل نہیں تھا۔ ان کو لکھنؤ کی جدائی بہت شاق تھی۔

نفیس و لذیذ غذائیں کھانے کے ذوق کے ساتھ، اچھا پکانے کے اسلوب سے واقفیت کا شوق رؤسا و عمائدین اور ان کی بیگمات میں تھا۔ وہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ ثانی الذکر شوق کو پورا کئے بغیر اول الذکر ذوق کو آسودگی نہیں ہو سکتی۔ کسی تیار شدہ غذا میں کوئی نقص محسوس ہو تو اس کی گرفت کے لئے پکانے کے طرز کا پوری طرح علم ہونا ضروری تھا۔ یہ علم بیگمات کو بچپن میں اچھی طرح سکھا دیا جاتا تھا۔ وہ امورِ خانہ داری میں زیادہ حصہ نہیں لیتی تھیں لیکن باورچی خانے کی نگرانی شوق سے کرتی تھیں۔

بڑے بڑے رئیس کبھی کبھی ایک آدھ چیز خود پکا لیتے تھے۔ ان کے یہاں اس شوق کو انجام دینے کے لئے مخصوص سامان رہا کرتا تھا۔ مثلاً لوہے کا چولہا اور لکڑیاں ٹکانے کے لئے چولہے کے آگے پلیٹ فارم نما مخصوص لوہے کا

پتّر جڑا ہوا تھا۔ اس چولہے کو جاذبِ نظر بنانے کے لئے لوہے کے پتروں سے چار دیواری جوڑ دی جاتی تھی۔ ملازم لکڑیاں جلا کر چولہا، برتن، پسا ہوا مسالا اور دوسری ضروری اشیا حاضر کرتے تھے اور رئیس تخت پر بیٹھ کر بڑے لطف سے کھانا پکاتے تھے۔ مرزا بہادر، مرزا محمد صادق علی خاں جن کے یہاں بہتر اور تجربہ کار باورچی ملازم رہتے تھے، بذاتِ خود سال میں ایک بار موسمِ گرما میں قورمہ اور موسمِ سرما میں مرغ مسلّم پکا کر ہماری تواضع کرتے تھے۔ میرے والد مرحوم اناس کا بہترین مزعفر پکاتے تھے۔

میں خود بچپن میں اپنی پسند کے کھانے پکانے کی مشق کرتا تھا۔ اسی مشق کی بدولت عنفوانِ شباب میں بادشاہ پسند دال، سلطانی دال، قورمہ، مچھلی اور کوفتہ معلائے عجمی بہتر سے بہتر باورچی کے مقابل پکالیتا تھا مگر اب آں قدح بشکست و آں ساقی نماند[15] کا معاملہ ہے۔ پکانے کا طریقہ جانتا ہوں، اس کے آگے کچھ نہیں عرض کر سکتا البتہ مشاہدات و تجربات کا ذخیرہ دماغ میں محفوظ ہے اور ان ہی معلومات کو اس تالیف[16] میں پیش کر رہا ہوں۔ (جاری ہے)

مشکل الفاظ کے معانی

۱۔ جوزی (ناریل، اخروٹ والا)
۲۔ محیرّالعقول (تعجب میں ڈالنے والا)
۳۔ گلتّھی (ابلے ہوئے نرم چاول)
۴۔ فریفتہ (دلدادہ)
۵۔ ظرف (برتن) جمع (ظروف)
۶۔ سلفچی (ہاتھ دھونے کا برتن)
۷۔ مودی خانہ (اناج رکھنے کا کمرا)
۸۔ پُخت (پکانے کا عمل)
۹۔ رِکاب دار (اچار، چٹنیاں اور مربّے بنا کر بیچنے والا)
۱۰۔ خاصگی (عمدہ چیز، امرا کا مصاحب)
۱۱۔ جامہ وار (پھول دار چادر)
۱۲۔ اچکن (کوٹ نما مردانہ لباس)
۱۳۔ سَٹک (پتلی چھڑی)
۱۴۔ خلعت (بادشاہ یا امرا کی طرف سے بطور عزت افزائی ملنے والی پوشاک)
۱۵۔ آں قدح بشکست و آں ساقی نماند (وہ پیالہ ٹوٹ گیا اور وہ ساقی نہ رہا۔ وہ زمانہ ہی نہ رہا)
۱۶۔ تالیف (ترتیب دینے کا عمل)

سرورق کی تشریح

قرآن کریم میں رب العالمین اللہ کا ارشاد ہے،

”پھر ذرا انسان یہی دیکھ لے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے۔“ (الطارق: ۵)

تخلیق کے نظام پر تفکر کا ایک پہلو مادی جسم ہے۔ جسم کے مادی رخ کی ضروریات، افعال، بیماری،

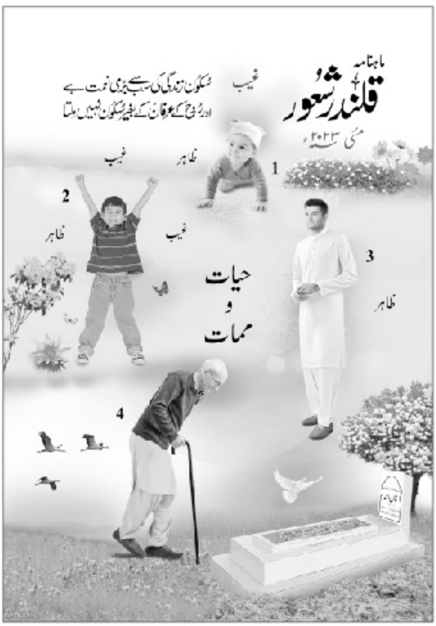

صحت، کارکردگی اور زندگی کے باقی امور کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو جسم کی حیثیت پیچیدہ اور حیرت انگیز مشین کے طور پر ہمارے سامنے آتی ہے۔ علاوہ ازیں نامیاتی، حیاتیاتی اور طبی سائنس کے شعبہ جات زندگی کے مادی پہلو تک محدود نظر آتے ہیں۔

قرآن کریم پر غور و فکر سے انکشاف ہوتا ہے کہ مادی رخ سے تخلیق کے مقصد کو سمجھنا کافی نہیں۔ بچہ جسم اور خدو خال کے ساتھ ساتھ ایک تشخص، مزاج، انفرادیت اور ذہن کا نام ہے۔ دلچسپ امر ہے کہ دنیا کا کوئی فرد اپنا تعارف مادی ساخت کی بجائے شخصیت اور صفات سے کروانا چاہتا ہے۔ صفات، مزاج اور شخصیت کے پہلو مادی طور پر نظر نہیں آتے لیکن کسی شخص سے ملاقات کے بعد ہم اس کی صفات کا تعارف چاہتے ہیں۔ لاشعوری طور پر ہم جانتے ہیں کہ مادی جسم اپنی صفات اور تشخص کے تعارف کے

بغیر گونگا، بہرا اور اندھا ہے اور اس کی حیثیت پتلے کی ہے۔

دس سال کا بچہ ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ آج سے پندرہ سال پہلے وہ کہاں تھا اور کس عالم میں تھا۔ مادی رخ کی روشنی میں جواب یہ ہے کہ پندرہ سال پہلے وہ اس دنیا میں موجود نہیں تھا۔ یہاں آنے سے پہلے وہ کہیں تھا۔ کہاں تھا، اسے نہیں معلوم۔

آدمی دراصل ایک پیچیدہ نامیاتی مشین ہے۔ مشین کا مطلب مختصر یا تفصیلی ہدایت پر عمل کرنے والا ایک میکانیکی نظام ہے جس کا اپنا تشخص نہیں، جس میں روح نہیں۔ روح داخل ہونے سے مشین کی صفات زیر بحث آتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جسمانی مشین کسی اَن دیکھے وجود کا لباس ہے۔

- ماں کے پیٹ سے دنیا میں آنا، لڑکپن اور جوانی سے گزر کر بڑھاپے تک پہنچنا، یہ سب کیا ہیں؟
- مشین ان مراحل سے کیوں نہیں گزرتی؟
- لباس کے پردے میں خود کو ظاہر کرنے والا اَن دیکھا وجود پہلے کہاں تھا؟
- وہاں اس کے معمولات کیا تھے؟
- یہاں آنے سے پہلے اس نے کتنے مقامات پر نقل مکانی کی اور کیوں کی؟
- اس دنیا میں آکر اس کا غیب ظاہر غیب ہونا کیا ہے؟

لباس پیدائش سے مرنے تک روز تبدیل ہوتا ہے۔ دو دن کا بچہ ایک دن کی حالت جیسا نہیں رہتا۔ ماہ و سال گزرنے کے ساتھ خدوخال مسلسل تبدیل ہوتے ہیں، بوڑھا حتیٰ کہ جوان آدمی بھی اکثر اپنے بچپن یا لڑکپن کی تصویر دیکھ کر دھوکا کھا جاتا ہے۔

بچہ دنیا میں ظاہر ہونے سے پہلے غیب میں تھا پھر ظاہر ہوا لیکن ظاہر کی حالت میں قائم رہنے کی بجائے مسلسل غیب اور ظاہر میں آنا جانا لگا رہا۔ گزرنے والا لمحہ غیب بن گیا۔ جس لمحے سے گزر رہا تھا، وہ لمحہ ظاہر کہلایا اور جن لمحات میں سے گزرنا باقی تھا، اس کو غیب کا نام دیا۔ دس دن کا بچہ گیارہویں دن میں داخل ہوتا ہے تو دس دن غیب میں چلے جاتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں دس دن کی زندگی ختم ہوگئی یا دس دن کی موت واقع ہوگئی۔ موت ختم ہونا نہیں بلکہ لمحات کا ظاہر ہو کر ریکارڈ میں واپس جانا ہے۔ ریکارڈ قائم رہتا ہے اور ہم اسی زندگی میں گزری ہوئی زندگی کے ریکارڈ کو پڑھ سکتے ہیں اور پڑھتے

ہیں۔ یاد کرنے پر ماضی کی تصویریں سامنے آجاتی ہیں۔ ہمیں ماضی کا ریکارڈ پڑھنے میں مشکل نہیں ہوتی، ہم چند لمحات میں اپنی فلم دیکھ لیتے ہیں۔

ذہن میں سوال آتا ہے کہ لباس اتنے مراحل اور تبدیلیوں سے کیوں گزرتا ہے؟

یہ جاننے کے لئے سرورق کو مزید گہرائی سے سمجھنے کی کوشش کی۔

سرورق پر بچے کی تصویر سے اوپر غیب لکھا ہے اور اس کے اوپر روشن خلا ہے۔ یہ دیکھ کر ذہن میں آتا ہے کہ دنیا میں آنے سے پہلے بچہ غیب میں کسی لطیف مقام پر موجود تھا جہاں آب و گل اور رنگ و بو کا مسئلہ نہیں تھا اسی لئے بچہ لطافت اور معصومیت کا پیکر ہوتا ہے۔ اگلے مرحلے میں بچے کے ساتھ ظاہر لکھا ہے اور پیچھے گہرا نارنجی رنگ موجود ہے۔ سمجھ میں یہ آتا ہے کہ بچہ اندھیری کوٹھڑی (ماں کے پیٹ سے) رنگوں کی دنیا میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ غیب کا لفظ تحریر ہے جس کا مطلب ہے کہ بچپن کا یہ حصہ غیب میں چلا جاتا ہے اور لڑکپن ظاہر ہوتا ہے جس میں جوش و جذبہ اور خوشی کے تاثرات نمایاں ہیں۔ پیچھے آسمانی رنگ، دھنک اور رنگین پھول ہیں — بچہ رنگوں کی اِس دنیا کے سارے رنگ قبول کرتا ہے اور قبول کرنے میں مزاحمت نہیں دکھاتا اس لئے خوش رہتا ہے۔ ان رنگوں سے اس کے شعور کی تعمیر ہوتی ہے لیکن یہی رنگ لاشعور سے دوری کا باعث بن جاتے ہیں۔

لڑکپن کے غیب میں جانے کے بعد سرورق پر دائیں طرف دراز قد نوجوان کھڑا ہے۔ پس منظر میں لکیریں اور دائرے ہیں۔ میری دانست میں نوجوان ہر شے کو ناپ تول اور حساب کتاب کی عینک سے دیکھنے لگا ہے اور لڑکپن کی ہنسی، فکرمندی میں تبدیل ہوگئی ہے۔ اس ادھیڑ بن میں جوانی کا حصہ غیب میں چلا جاتا ہے اور مضمحل اعضا کا بوڑھا آدمی لاٹھی ٹیکتے ہوئے نمودار ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی دائرے کی شکل بنی ہوئی ہے یعنی زندگی کا دائرہ مکمل ہو رہا ہے۔ پرندے گھروں کی جانب لوٹ رہے ہیں اور بوڑھی مشین کے اندر قید روح آزاد ہوکر اگلی دنیا کی جانب روانہ ہو جاتی ہے۔ قبر پر سفید کبوتر اس کی علامت ہے۔ (تشریح: مکسل مینا)

Manufacturer of
Embroided Lace & Fabrics

PRIME LACE INDUSTRIES
(PVT.) LTD.

C-8, S.I.T.E, Hyderabad
Tel: 022-3880107 Fax: 022-3880381

بی بی انورادھا

آئینہ

خوشی اور خوف جذبات ہیں۔ جذبات کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے اثرات ماحول پر محیط ہوتے ہیں۔ مریضہ کے شوہر کے دل میں خوف کو وہاں موجود افراد محسوس کر رہے تھے اور ان لہروں کو قبول کر کے اس کے خوف کو تقویت دے رہے تھے۔

مدیحہ اسپتال کے وٹینگ لاؤنج میں اپنی باری کا انتظار کر رہی تھی۔ بیٹی ہمراہ تھی۔ تھوڑی دیر میں آس پاس شور سنائی دیا۔ کوئی اونچی آواز میں بول رہا تھا اور لوگ اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ سرسری نظر ڈال کر دوبارہ اندر میں متوجہ ہو گئی جہاں قلب الفاظ کو پرو کر سخن کے تانے بانے بُن رہا تھا۔ ترجمہ:

"اچھے خیالات ساحل پر سیپ کی طرح ہیں،
آدمی ان کو دیکھے بغیر گزر جاتا ہے،
پھر ایک وقت آتا ہے جب وہ ان کے پاس
سے گزرتے ہوئے ایک سیپ اٹھالیتا ہے،
بناوٹ کو سراہتا ہے اور مسحور ہو جاتا ہے
یوں ساحل سے سیپ اٹھانے کے سلسلے کا آغاز
ہوتا ہے جو دراز ہوتے ہی پُرمسرت شام کے
ساتھ اختتام کو پہنچتا ہے۔"

دل نے پوچھا کہ تم کب زندگی کے ساحل سے اچھے خیالات کی سیپ اٹھاؤ گی—؟ سوال سن کر کر چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی مگر اگلے لمحے پیشانی پر ناگواری کی لہریں نمودار ہوئیں۔ اس نے کاؤنٹر کی جانب دیکھا کہ آخر وہاں کیا ہو رہا ہے اور یہ کون ہے جس نے اسپتال سر پر اٹھالیا ہے اور اس کے سکون میں مخل ہوا ہے؟ باہر کے شور پر ذہن مرکوز ہوا تو اندر کی آواز مدہم ہو گئی۔

وہ کہہ رہا تھا— آپ جانتے ہیں کہ میری بیوی کی طبیعت ناساز ہے اور وہ چار پانچ دنوں سے اسٹیرائڈز پر ہے۔ انشورنس کمپنی نے کس بنیاد پر دعویٰ مسترد کیا ہے؟ مینجر سے بات کروائیں۔ کیا کوئی اتنا بے حس ہو سکتا ہے؟ کہاں ہے وہ نیا

مینیجر؟ آپ میرے ساتھ بیٹھ کر معاملہ حل کیوں نہیں کرتے؟ مجھے شکایتی فارم دیں تا کہ میں اس بات کو یقینی بناؤں کہ جس کرب سے گزر رہا ہوں، اس کے لئے آپ لوگ جوابدہ ہوں۔

مدیحہ نے آدمی کی باتیں سن کر اس کی جگہ خود کو رکھا تو احساس ہوا کہ اس کی ذہنی کیفیت کیا ہے۔ اس نے بیوی کی بیماری کو قبول نہیں کیا تھا اور انہونی سے خوفزدہ تھا۔ ذہنی دباؤ اس قدر تھا کہ انشورنس کمپنی کا غصہ اسپتال کے عملے پر نکال رہا تھا۔ دراصل اسپتال کے عملے نے بل کی ادائیگی کے معاملے پر اس کو مطلع کیا کہ جس انشورنس کمپنی کا آپ نے حوالہ دیا ہے، اس نے آپ کا medical claim مسترد کر دیا ہے۔ وہ شخص اس صورتِ حال کے لئے تیار نہیں تھا، سنتے ہی سیخ پا ہوگیا۔

مدیحہ نے استقبالیہ عملے کی آنکھوں میں بے بسی دیکھی۔ انشورنس کی کلیئرنس کے معاملے میں ان کا دخل نہیں تھا۔ انشورنس کمپنی ایک الگ ادارہ ہے جو claim کو قبول یا رد کرنے میں خود مختار ہے۔ اس شخص پر ترس آیا۔ ہو سکتا ہے کہ اس کو بھی احساس ہو کہ وہ غلط جگہ پر غصہ اتار رہا ہے۔ نرسوں اور عملے نے اس کی حالت دیکھ کر اندازہ لگالیا تھا کہ بیوی کی بیماری اور مالی حالات کے سبب جو گھٹن اس شخص کے اندر پیدا ہوگئی ہے، اسے باہر نکلنے کی ضرورت ہے ورنہ خدانخواستہ دماغ مزید دباؤ قبول کرنے سے انکار نہ کر دے۔ نرسیں اسے سمجھا رہی تھیں۔

نیم پاگل رویے کو دیکھ کر خیال آیا کہ شاید یہ اس امید پر ہذیانی انداز میں مایوسی کا اظہار کر رہا ہے جیسے انشورنس کمپنی معجزاتی طور پر بیوی کے علاج کے لئے اس کا دعویٰ قبول کر لے گی۔ غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوششیں اب تک بے سود تھیں۔ تکلیف کا ایک ہی مداوا تھا کہ انشورنس کمپنی اسپتال کے بل کی ادائیگی کر دے۔

غم و غصے کا سلسلہ طویل ہوا تو مدیحہ نے سوچا کہ تکلیف اپنی جگہ لیکن قوانین کی رُو سے اس شخص کی باتیں غیر معقول ہیں۔ ذہنی دباؤ سے اس کی فہم کا دروازہ بند ہوگیا ہے۔ اس کا رویہ ضدی بچے کی طرح تھا جس کے ٹوٹے ہوئے کھلونے کا جڑنا ممکن نہ ہو لیکن وہ اسے جوڑنے پر اصرار کرے۔ یہ ایک ناظر کی حیثیت سے مدیحہ کا تجزیہ تھا۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ اپنے عزیز کو کھونے کے خوف نے دماغ ماؤف کر دیا تھا۔

آواز سے زیادہ آنکھیں کہانی سنا رہی تھیں کہ وہ اس وقت کو واپس لانے میں کتنا بے بس ہے جب اس کی دنیا میں سب کچھ ٹھیک تھا، بیوی کی صحت اچھی تھی اور گھر جنت کا گہوارہ۔

خوشی اور خوف جذبات ہیں۔ جذبات کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے اثرات ماحول پر محیط ہوتے ہیں۔ غصہ اشتعال اور خوف کی لہریں پیدا کرتا ہے جب کہ نرمی سکون کی چادر بن جاتی ہے۔ مسکراتے چہرے کو دیکھ کر سب کے چہروں پر مسکراہٹ آتی ہے اور غمزدہ چہرے سے ماحول میں غم کی لہریں دَور کرتی ہیں۔

مریضہ کے شوہر کے دل میں خوف کو وہاں موجود افراد محسوس کر رہے تھے اور ان لہروں کو قبول کرکے اس کے خوف کو تقویت دے رہے تھے۔ جارحانہ رویے کا اظہار کرکے وہ خود کو مضبوط اور حق بجانب سمجھ رہا تھا۔ سب کو اس سے ہمدردی تھی لیکن سب جانتے تھے کہ یہ رویہ غیر معقول ہے۔

مدیحہ کا ذہن منتشر ہو گیا۔ ذہن پر بوجھ بڑھا تو احساس ہوا کہ یہ کیفیت شور کرنے والے آدمی کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کا تعلق اندر میں کسی رویے سے ہے جو مدیحہ کی توجہ کا منتظر ہے اور اس کا تدارک چاہتا ہے۔

تلاش کیا کہ اس کے اندر ایسی کوئی بات ہے جو اس آدمی کے رویے سے مماثل ہو—؟

مدیحہ نے غیر جانبدار ذہن سے اندر دیکھا تو ناخوش گوار لہروں کی فلم نظروں سے گزری اور ماضی کی ایک تصویر پر رک گئی۔ تصویر دیکھ کر دل لرز گیا اور ہاتھ پیروں میں جان نہ رہی۔

بیٹی پاس بیٹھی تھی۔ اس نے ماں کے بازو کو نرمی سے چھو کر فکر مندی سے پوچھا، کیا ہوا؟

ماں نے تسلی دی کہ میں ٹھیک ہوں۔

جب تک اس کے اوسان بحال ہوئے، مشتعل شخص جا چکا تھا۔ اب وہاں خاموشی تھی۔

جتنی دیر اسپتال میں رہی، خود کو مضبوط رکھنے کی کوشش کی۔ جیسے ہی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی تو آنسوؤں کے گرد بند کھل گیا۔ ماں کی حالت دیکھ کر بیٹی پریشان تھی کہ کیا کرے۔ اس نے ماں کو کبھی روتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ بار بار پوچھ رہی تھی کہ کیا ہوا۔

مدیحہ نے آہ بھرتے ہوئے کہا، اس لئے رو رہی ہوں کہ اس شخص کے آئینے میں اپنی تصویر دیکھی

ہے۔ دماغی حالت ٹھیک نہ ہونے کی وجہ سے اس کا رویہ غیر مناسب تھا اور وہ اسپتال کے عملے کو دباؤ میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس سے آپ کا کیا تعلق ہے؟ بیٹی نے پوچھا۔

تعلق ہے۔ اس کی طرح میں نے بھی زندگی میں اپنا غصہ ان لوگوں پر اتارا جن کو خود سے کمزور سمجھا اور ان لوگوں پر بھی جن کے مقابل میں خود کو صحیح سمجھتی تھی۔ میں کتنی غلط تھی! میرا خیال تھا کہ اصولوں پر فیصلے کرتی ہوں۔ یہ نہیں سوچا کہ ہر بات کے تین رخ ہوتے ہیں۔

۱۔ میرا سچ

۲۔ لوگوں کا سچ

۳۔ اصل سچ یا اندر کی تصویر

ہر معاملے میں میرا فارمولا یہ تھا،

میں بمقابلہ لوگ

ہمیشہ جارحانہ رویہ اختیار کیا جیسے میں جنگ جُو ہوں اور راستے میں آنے والی ہر شے کو فتح کر کے آگے بڑھنا چاہتی ہوں۔ میں نے زندگی کو میدانِ جنگ بنادیا۔ کاش مجھے احساس ہوتا کہ معاملات بات کرنے سے حل ہوتے ہیں — لڑنے سے نہیں۔ میرا خیال تھا کہ اہمیت جتانے کے لئے آواز بلند کرنی پڑتی ہے۔ آج زندگی نے آئینہ دکھایا کہ خود کو حق بجانب سمجھ کر اونچی آواز میں بات کر کے دوسروں کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کرنے والے لوگ بند ذہن ہوتے ہیں۔

مدیحہ نے بیٹی سے کہا، میں اس لئے رو رہی ہوں کہ مرنے کے بعد اپنی فلم دیکھ کر اسی طرح پچھتاؤں گی جس طرح آج اپنا ماضی دیکھ کر رو رہی ہوں۔ روحانی مسافر کی حیثیت سے میں نے اپنی ذمہ داری سے غفلت برتی اور کئی سال ضائع کر دیئے۔ بے خبر رہی کہ زندگی ضابطۂ اخلاق اور طرزِ عمل کا امتحان ہے۔ میرے ہونے کا سبب جسم کے اندر روح ہے جسے نظر انداز کر کے میں کی عینک سے دنیا کو دیکھا۔ میں قدرت کی شکر گزار ہوں جس نے مجھے آئینہ دکھایا اور اصلاح کا موقع دیا۔ یہ سب کہتے ہوئے مدیحہ کی نظریں خلا میں گم تھیں۔ ہر منظر فلم کی طرح نظروں کے سامنے سے گزر رہا تھا۔

بات ختم کر کے اس نے بیٹی کی طرف دیکھا اور ہاتھ سے اس کا رخسار تھپتھپاتے ہوئے کہا، وہ دن گزر گئے، یہ دن موجود ہیں، ان کو اچھا بناتے ہیں تا کہ کل جب ان دنوں کو یاد کریں تو پچھتاوا نہ ہو — خوشی اور اطمینان ہو۔ چڑیوں کے کھیت چگ جانے پر پچھتاوے کا فائدہ نہیں

ہے۔ جو ہو چکا ہے، اس سے سیکھنا ہے اور سیکھ کر آگے بڑھنا ہے۔

بیٹی کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

ماں کو روتا دیکھ کر وہ پریشان ہو گئی تھی۔

ماں مسکرائی تو بیٹی بھی مسکرا دی۔

گاڑی مرکزی شاہراہ سے گزر رہی تھی۔

ماں گنگنائی تو بیٹی بھی ہم آواز ہوئی۔

ہم فتح یاب ہوں گے،

دل میں سکون اور مسرت کے ساتھ۔

گاڑی رہائشی عمارت کے پارکنگ ایریا میں داخل ہوئی۔ گاڑی سے اتریں تو چوکیداری کے لئے رات کی ڈیوٹی پر مامور خاتون نے گیٹ کھولا۔ اس کا نام خلود تھا۔ خلود کی میز پر گلابی رنگ کا کپڑا رکھا ہوا تھا جسے دیکھ کر مدیحہ کی بیٹی نے خوش گوار حیرت سے پوچھا، یہ گلابی کپڑا بہت حسین ہے، آپ اس سے کیا بنا رہی ہیں؟

تعریف سن کر خلود خوش ہو گئی کہ کسی نے اس کے پسندیدہ مشغلے میں دلچسپی لی۔

اس نے کہا، دوست کے لئے لباس تیار کر رہی ہوں۔ اسے ایک ڈرامے میں شرکت کرنی ہے جس میں اس کا کردار پھول پری کا ہے۔ کیا آپ دیکھنا چاہتی ہیں کہ میں کیا بنا رہی ہوں؟

دونوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

خلود نے بتایا کہ وہ مصنوعی پھولوں کی پتیاں کپڑے پر ایک ایک کر کے چپکائے گی تاکہ لباس پنکھڑیوں سے ڈھک جائے اور پھول کی طرح نظر آئے۔ وہ ہیڈ بینڈ، بازو بند، بُندے اور اس طرح کی چند چیزیں بھی بنا رہی تھی۔

مدیحہ کی بیٹی نے خلود کے ہنر کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ آپ کے اندر ڈیزائننگ کی صلاحیت ہے، آپ کو فیشن ڈیزائنر ہونا چاہئے۔ جو چیزیں آپ بنا رہی ہیں، وہ کسی فیشن ڈیزائنر کے کام سے کم نہیں۔ آپ نے فیشن شوز میں دیکھا نہیں کہ ماڈلز جب ڈیزائنر کے بنائے ہوئے لباس پہن کر ریمپ پر چلتی ہیں تو کیسی لگتی ہیں؟

خلود کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

اس نے کہا، اوہ! بہت شکریہ! میں فیشن ڈیزائنر بننا چاہتی ہوں اسی لئے کورس میں داخلے کی فیس جمع کرنے کے لئے تین ملازمتیں کرتی ہوں۔ آپ کی حوصلہ افزائی سے اعتماد بڑھا ہے کہ میرا کام لوگوں کو پسند آئے گا۔

ماں بیٹی لفٹ کی طرف بڑھیں تو قدم مسرت سے سرشار اور اندر میں سکون تھا۔ مدیحہ نے

بیٹی کو توصیفی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے سوچا کہ اس کے الفاظ نے کسی کو اپنے خواب پورے کرنے کا سہارا دیا ہے اور مجھے بہت کچھ سکھایا ہے۔ مدد صرف پیسوں سے نہیں کی جاتی، اس کے لئے سوچنے والا ذہن اور وہ دل چاہئے جو خود سے پہلے دوسروں کو مقدم رکھتا ہے۔ میٹھے بول کیا کچھ کر سکتے ہیں!

"ایک میٹھا بول اور کسی ناگوار بات پر چشم پوشی اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے دکھ ہو۔ اللہ بے نیاز ہے اور بردباری اس کی صفت ہے۔" (البقرۃ: ۲۶۳)

وہ سوچ رہی تھی کہ میری بیٹی جب کبھی اس واقعے کی فلم دیکھے گی تو بے حد خوش ہوگی۔

قارئین! زندگی فلم ہے۔ ہر منظر کہیں سے آتا ہے اور مظاہرہ کر کے (ریکارڈ ہو کر) کہیں چلا جاتا ہے۔ فرد اس دنیا میں رہتے ہوئے جب چاہے، ماضی کی ریکارڈنگ دیکھ سکتا ہے اور دیکھتا ہے۔ یہی ریکارڈ شدہ فلم دوسری دنیا میں اس کی زندگی بنتی ہے۔ اگر فلم میں اس کا کردار انسان دوست ہے تو دیکھ کر خوشی ہوتی ہے۔ اگر فلم میں انتشار ہے تو افسوس کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

درخت کہانی ــــ قلندر شعور کی زبانی

درخت باشعور مخلوق ہیں۔ یہ سنتے، دیکھتے، سمجھتے، بولتے اور غور و فکر کرتے ہیں۔ کیا آپ نے درخت کو غور و فکر کرتے دیکھا ہے ـــ؟

اٹلی کا علاقہ پلیہ (Puglia) زیتون کے منفرد شکل کے درختوں کے لئے مشہور ہے۔ یہاں زیتون کے قدیم درخت ہیں۔ ان درختوں کی ٹہنیوں کا رخ کچھ عرصے بعد بدل جاتا ہے۔ منفرد شکل کے درختوں میں ایک درخت سب سے نمایاں ہے، محققین نے اسے Pensive Olive Tree کا نام دیا ہے۔ ساخت ایسی ہے جیسے کوئی شخص گیان میں گم اور مراقب ہو۔ یہ کئی سو سال پرانا ہے۔

محمد عدنان خان

پورب کے ہم زاد

رنگ و چمن، عروج و زوال، عشق و مستی اور فنا و بقا کے رنگوں سے معمور صدیوں پر محیط داستان جس کی مکانیت تبت کی فلک بوس چوٹیوں سے لے کر ٹیکسلا کی سرسبز وادیوں تک پھیلی ہوئی ہے۔

ردا کو ٹیکسلا میں صدیوں پرانے کشان دورِ حکومت کا شہزادہ ملا جو کچھ کہنا چاہتا تھا۔ شہزادے سے دور رکھنے کے لئے مکروہ صورت بوڑھا بجر ولال سامنے آیا اور ردا کی پریشانیوں کا آغاز ہوا۔ ایک بزرگ نے ردا کو بتایا کہ شہزادے کے ہم زاد کو آزاد کروانے کے لئے تمہارا انتخاب ہوا ہے۔ ردا ایک حادثے میں کوما میں چلی گئی۔ اسپتال میں اس کے اندر سے روشنی کا پرت نکلا اور ماضی میں سفر کرتے ہوئے ہزاروں سال پہلے کے تبت میں لے گیا جہاں جوبی پہاڑ پر بنی عبادت گاہ اس کا مسکن تھی۔ یہاں بزرگ خاتون رہتی تھیں جو شہزادے کے علاج کے لئے محل گئی ہوئی تھیں۔ شیطانی قوتوں کو ردا کی آمد کا علم ہوا تو مشکلات کھڑی کیں۔ محل سے واپس آکر بزرگ خاتون نے جوبی پہاڑ پر رہنے کی بجائے تبت کے اس علاقے کا رخ کیا جہاں ان کے استاد مقیم تھے۔ شہزادہ سلطنت چھوڑ کر ان کی تلاش میں نکلا۔ اس دوران میں بادشاہ کنذل کڈفیز کے بھائی راجاپدل نے لچھاوی کے ساتھ مل کر تخت پر قبضہ کر لیا اور شہزادے اور بزرگ خاتون کو مارنے کی ہر طرح سے کوشش کی مگر وہ محفوظ رہے۔ شہزادے اور بزرگ خاتون کی شادی ہوگئی۔ دشمن شہزادے اور اس کے خاندان تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے مگر بزرگ خاتون تک نہ پہنچ سکے۔ وہ کہاں گئیں، کسی کو پتہ نہیں چلا۔ اس کے ساتھ ہی ردا بھی اگلے سفر پر روانہ ہوئی۔

قدیم غار کا تنگ و تاریک راستہ آگے جا کر کشادہ سرنگ میں تبدیل ہوگیا۔ آگے بڑھنے پر چندن کی لکڑی سے بنا دروازہ نظر آیا جسے دھکا دیتے ہی اندر کا منظر دیکھ کر حیران رہ گئی کہ میں کہاں آگئی ہوں۔ اطراف کا جائزہ لیا۔ کمرے میں جدید طرز مگر بڑے سائز کا فرنیچر تھا جیسے دیو قامت لوگوں کے لئے بنایا گیا ہو۔ سنگل بیڈ ہمارے ڈبل بیڈ کی طرح تھا۔ کمرے کی چھت کی اونچائی لگ بھگ 20 فٹ سے زیادہ تھی۔ ہر چیز سائز کے لحاظ سے دگنی تھی۔

فرنیچر سے اٹھتی چندن کی بھینی بھینی مسحور کردینے والی خوش بو سے کمرا مہک رہا تھا۔ کمرے اور اس سے ملحق غسل خانے میں سہولیات اور سامان کی نظیر آدمی کی دنیا میں نہیں تھی۔ یہاں ہر چیز ہمارے قد و قامت کے لحاظ سے بڑی تھی۔ میں نے بیگ اتارا اور منہ ہاتھ دھونے کے لئے غسل خانے کا رخ کیا۔ وہاں میرے سائز کا نیا لباس ٹنگا ہوا تھا۔ لباس تبدیل کیا اور تازہ دم ہو کر باہر آئی تو میز پر گرم گرم کھانا رکھا ہوا تھا جس کی اشتہا انگیز خوش بو سے بھوک بڑھ گئی۔ میزبان جو بھی تھا — رکھ رکھاؤ والا تھا۔

کشان سلطنت اور ماچو پیچو کے بعد میں جس دور میں داخل ہوئی تھی، اس کی تہذیب کا اندازہ کمرے کی آرائش اور میز پر کھانا لگنے کی تنظیم سے ظاہر تھا۔ کشان سلطنت میں خاصا وقت گزار کر یہاں آنا قدیم سے جدید دور میں داخل ہونا تھا۔ ہر شے عجیب اور انوکھی تھی۔ میزبان کے متعلق سوچتے ہوئے میں کھانا کھانے کے ارادے سے بیٹھ گئی کہ یہ میرے لئے لگایا ہے، بسم اللہ پڑھ کر کھانا شروع کر دینا چاہئے۔

جس نفاست اور ترتیب سے کھانا رکھا گیا تھا، ذائقہ اس سے زیادہ لذیذ تھا۔ کھانے سے فارغ ہوئی اور ہاتھ دھو کر بستر پر بیٹھی تو کمرے میں کھنکھناتی نسوانی آواز گونجی،

”قہوہ، چائے یا کافی میں سے آپ کیا لینا پسند فرمائیں گی؟“

میں کمرے میں خود کو اکیلا سمجھ رہی تھی، آواز سن کر ہڑبڑا گئی۔ گویا میرے علاوہ بھی کوئی یہاں موجود ہے۔ کون ہے اور کہاں ہے؟ کمرے میں نظر دوڑاتے ہوئے پوچھا،

”میں کہاں ہوں اور تم کون ہو؟“

سریلی آواز نے بتایا،

”میرا نام ’بنتِ زندایہ‘ ہے۔ میں آپ کی خادمہ ہوں اور آپ ہماری مہمان ہیں۔ یہ سطح مرتفع باجیان کا علاقہ ہے — آپ سرکاری گیسٹ ہاؤس میں قیام پذیر ہیں۔ کل ایک مقدمے میں بطور گواہ پیش ہوں گی۔ ایک جن زادے کے قتل کا الزام ہے۔ اسے کچھ آدمیوں نے قیدی بنایا پھر قتل کر دیا۔ جس نے قتل کیا ہے، اس نے ہم زادوں کی فوج تیار کر رکھی ہے۔ جسے قتل کیا گیا، وہ کوئی عام جن نہیں تھا اور جس پر قتل کا الزام لگایا گیا ہے، وہ بھی کوئی عام شخص نہیں۔ عدالت کے حکم پر سلطنت کشان کے شہزادے جے ونت کے ہم زاد کی

ملکیت میں جو خزانہ ہے، اسے عدالتی تحویل میں لینے کی کارروائی جلد شروع کردی جائے گی۔ کل کی سماعت جس میں آپ کو بطور گواہ پیش کیا جائے گا، کے بعد جے ونت اور اس کے ساتھی ہم زادوں کی گرفتاری عمل میں لائی جائے گی — حالات سنگین ہیں۔ بجر ولال نامی بوڑھا جادوگر جو اس وقت آپ کی دنیا میں مقیم ہے، خود کو سلطنت کشان کا وارث گردانتا ہے۔ اس کے دعوے کی تصدیق کا انحصار آپ کی گواہی پر ہے۔"

بنتِ زندایہ نے تفصیل سے معاملہ میرے سامنے رکھا۔ گویا وہ عدالت میں میری پیشی کی اہمیت واضح کر رہی تھی۔

اس کے خاموش ہوتے ہی میں نے پوچھا، تم کون ہو؟ تم محض خادمہ نہیں ہوسکتیں۔

درست اندازہ لگایا آپ نے۔ مقدمے کی سماعت کرنے والوں میں میرا بھی نام ہے۔ آپ کی خدمت اور حفاظت کی ذمہ داری مجھے دی گئی ہے۔ میں نے فائل پڑھ لی ہے اور جانتی ہوں کہ اصل قصوروار کون ہے۔ آپ عرب نژاد ہیں، میرا تعلق بھی عرب سے ہے۔ باجیان کا علاقہ سرزمین عرب کی حدود میں واقع ہے۔ آپ کے سر پر بزرگوں کا دستِ شفقت ہے۔ آپ نے جے ونت کی مدد کے لئے خود کو رضا کارانہ طور پر پیش کیا جس کی بھاری قیمت آپ کے خاندان نے چکائی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ آپ کوما میں ہیں جب کہ آپ کے بہنوئی صورتِ حال سے کسی نہ کسی حد تک واقف ہو چکے ہیں۔ بوڑھا جادوگر بجر ولال آپ کی جان کے درپے ہے اور آسن جمائے گھر کے باہر بیٹھا ہے مگر بے فکر رہئے، حفاظت کا معقول انتظام کیا گیا ہے۔ ہماری جانب سے بھی معاونت کی جارہی ہے۔

اتناسب جانتی ہیں تو یہ کیوں نہ جان سکیں کہ قرقوق کی موت کا ذمہ دار کون ہے، جے ونت بے قصور ہے اور بجر ولال کی اصلیت کیا ہے؟

محسوس ہوا کہ وہ سوال سن کر قریب آئی ہے مگر سمجھ سے بالاتر تھا کہ وہ میری نظروں سے اوجھل کیوں تھی؟

زندایہ گہرا سانس لے کر بولی، انسان کے سامنے جنات کے اختیارات محدود ہیں۔ ماچو پیچو میں جو ہوا، وہاں کا استدراجی جال اسے دھندلا دکھا رہا ہے۔ انسان اشرف المخلوقات ہونے کی وجہ سے جنات سے بہت آگے ہے۔ جہاں ہماری سوچ پہنچتی ہے، وہاں انسان خود پہنچ جاتا ہے۔ اس کی ایک مثال آپ ہیں۔ کل عدالت میں

سب کچھ واضح ہوجائے گا۔ آپ کی گواہی ہمارے لئے معتبر ہے۔ کچھ چیزوں کا ہمیں اندازہ ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ فیصلے اندازوں کی بنیاد پر نہیں کئے جاتے۔

میز پر رکھے برتنوں کی جگہ اب عربوں کی طرز کی کیتلی میں قہوہ، کپ اور پرچ کے ساتھ پلیٹ میں اعلیٰ قسم کی کھجوریں تھیں۔ ساتھ ہی بہت ہلکی آواز میں عربی دھنیں بجنے لگیں۔

نسوانی آواز پھر گویا ہوئی، سرزمین عرب کا قہوہ آپ کے لئے خصوصی طور پر تیار کروایا گیا ہے۔ قہوے سے اٹھتی بھاپ کی خوش بو اپنی جانب کھینچ رہی تھی۔ بنتِ زندایہ کے پُرخلوص اور دوستانہ انداز سے دیئے گئے جوابات سے میں مطمئن ہوگئی تھی۔

سلسلۂ کلام بڑھاتے ہوئے میں نے پوچھا، میں غیر مرئی اجسام دیکھ سکتی ہوں پھر کیا وجہ ہے کہ آپ مجھے نظر نہیں آرہیں؟

اس کی وجہ آپ کے پاس موجود تھیلا ہے۔ اس میں یقیناً کوئی شے ایسی ہے جس کا تعلق موجودہ معاملے سے ہے۔

تھیلے میں لچھاوی کے بیٹے دندان کا حنوط شدہ ہاتھ تھا جو اس بات کا ثبوت تھا کہ بجرولال کا تعلق شاہی خاندان سے نہیں تھا۔ اس کے سیاہ، بھدّے اور غیر معمولی بڑے ہاتھ کا پنجہ دراصل ایک جینیاتی مسئلہ تھا جس کی ایک الگ داستان ہے۔ مختصر یہ کہ سیدھے ہاتھ کے پنجے میں غیر معمولی تبدیلی اس کے خاندان کے منفی طرز عمل کے نتیجے میں کسی کی بددعا کا نتیجہ تھی جس کا اثر نسل در نسل منتقل ہورہا تھا۔ بجرولال کا ہاتھ اس کا ثبوت تھا۔ اس کے سیدھے ہاتھ کا پنجہ ہوبہو دندان کے ہاتھ کے پنجے کی نقل تھا۔

بنتِ زندایہ کے اشارہ کرنے پر میں نے تھیلے کی طرف ہاتھ بڑھایا تو وہ فوراً بولی، رک جائیں، سوچ سمجھ لیں، ہمیں کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ آپ کو بھی کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ مجھے دیکھ کر کہیں آپ خوفزدہ نہ ہوجائیں۔ ہماری جسمانی ساخت میں فرق ہے اور قد عام آدمی سے اونچا ہے۔

بنتِ زندایہ کو شاید علم نہیں تھا کہ میں کیا کچھ دیکھ کر یہاں پہنچی ہوں۔ یہی سوچ کر بیگ اتارا اور دیوار کے ساتھ لگے دمکتے ہوئے بلوریں ہک پر لٹکا دیا۔ بیگ کیا اتارا، ایسا لگا کہ آنکھوں میں ستارے جگمگانے لگے ہوں۔ ہر چیز کا رنگ نکھر گیا تھا۔ کمرا جیسے شاہی محل کا مہمان خانہ تھا۔

بنتِ زندایہ پر نظر پڑی تو میرا قد اس کے آدھے قد سے بھی کم تھا۔ نیلگوں سفید لباس جس پر چاندی کے ستاروں کا کام اس کے رنگ روپ پر بہت بچ رہا تھا۔ شعور پر بوجھ محسوس ہوا مگر پھر سب معمول کے مطابق ہوگیا۔

زندایہ خوب صورت جن زادی تھی۔ اس کی بڑی بڑی روشن آنکھوں میں چمک ذہانت کی دلیل تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ میں اسے دیکھ کر خوفزدہ نہیں ہوئی۔

وہ کچھ دیر مزید بیٹھی اور عدالت میں پیشی کے طریقِ کار سے آگاہ کرتی رہی۔ جاتے ہوئے اپنے لباس کی طرح ایک لباس میری طرف بڑھایا کہ صبح زیب تن کرلینا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ مجھے اس کا لباس پسند آیا تھا۔

جنات کی دنیا میں طرزِ زندگی جدید اور اخلاق کا معیار اعلیٰ تھا۔ ہم آدمی اس معاملے میں بہت پیچھے تھے۔ کمرے میں موجود ہر شے گواہی دے رہی تھی کہ جنات سائنس و ٹیکنالوجی میں بھرپور ترقی کر چکے تھے۔ بہر حال ایسا لگتا تھا کہ اپنے دور میں میری واپسی اب دور نہیں تھی۔ جو گزرا، وہ خواب کی مانند لگ رہا تھا اور خواب کی طرح گزر رہا تھا۔ خواجہ میر دردؔ نے خوب کہا ہے،

وائے نادانی کہ وقتِ مرگ یہ ثابت ہوا
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سنا افسانہ تھا

مرگ یعنی موت دراصل ایک حالت سے دوسری حالت اور ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا ہے۔ میرے ساتھ بھی اسی طرح کے حالات تھے البتہ واپسی کی خوشی نے سرشاری کی کیفیت پیدا کردی تھی۔ گھر والوں کو یاد کرتے ہوئے میں نیند کی وادی میں اتر گئی۔

صبح صادق کے وقت زندایہ جگانے آئی۔ فجر کی نماز ہم نے ساتھ پڑھی۔ پھر اس نے لحن سے اور نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ سورۃ القیٰمۃ کی تلاوت کی۔ ترجمہ یہ ہے،

”نہیں! میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی۔ اور نہیں! میں قسم کھاتا ہوں ملامت کرنے والے نفس کی۔ کیا انسان یہ سمجھ رہا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہ کرسکیں گے؟ کیوں نہیں؟ ہم تو اس کی انگلیوں کی پور پور تک ٹھیک بنا دینے پر قادر ہیں۔ مگر انسان چاہتا یہ ہے کہ آگے بھی بد اعمالیاں کرتا رہے۔ پوچھتا ہے، آخر کب آنا ہے وہ قیامت کا دن؟ پھر جب آنکھیں پتھرا جائیں گی اور چاند بے

نور ہو جائے گا اور چاند سورج ملا کر ایک کر دیئے جائیں گے، اس وقت یہی انسان کہے گا کہ کہاں بھاگ کر جاؤں؟ ہر گز نہیں! وہاں کوئی جائے پناہ نہ ہوگی۔ اس روز تیرے رب کے سامنے جا کر ٹھہرنا ہوگا۔ اس روز انسان کو اس کا سب اگلا پچھلا کیا کرایا بتادیا جائے گا بلکہ انسان خود اپنے آپ کو خوب جانتا ہے۔ چاہے وہ کتنی ہی معذرتیں پیش کرے۔"

(القیٰمۃ: ۱۔۱۵)

زندایہ کی آواز میں ایسا سوز و گداز تھا کہ ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے۔ وہ بھی رو رہی تھی اور میں بھی۔ اگر ہم قرآن کریم کو سمجھ کر پڑھیں تو اطاعت کے دائرے میں داخل ہو جائیں گے۔

دعا مانگ کر ہم اٹھے تو ناشتہ لگ چکا تھا۔ کچھ اور جنات بھی میری خدمت پر مامور تھے۔ زندایہ کی ہدایات کے مطابق وہ سب اپنے حصے کا کام منظم انداز میں کر رہے تھے۔

ناشتے کے بعد گاڑی لینے آگئی تھی۔ گاڑی کیا تھی، اڑن طشتری کی مانند ہوا میں معلّق سواری تھی جو کششِ ثقل کے برخلاف توازن میں تھی۔ بیٹھنے پر معلوم ہوا کہ یہ خودکار نظام سے منسلک جدید آلات سے آراستہ تھی۔

وہ ہنستے ہوئے بولی، ہم نے نوعِ آدم سے بہت کچھ سیکھا ہے اور سیکھتے رہتے ہیں۔ ہمارے یہاں بھی تحقیقات ہو رہی ہیں جن سے آپ کی دنیا کا عام آدمی اور محقق لاعلم ہے۔ انہوں نے ہم سے فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ ہمارے متعلق طرح طرح کے قصے کہانیاں مشہور کر دی ہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ افسوس ہے کہ آدمی جب ہمارا ذکر کرتا ہے تو ہمیں منفی انداز سے پیش کرتا ہے۔

زندایہ کا گلہ بجا تھا۔

ایسا کیوں ہے، یہ ایک طویل بحث ہے۔

گاڑی عدالت کی حدود میں اتر چکی تھی۔

جلد ہی مجھے ججوں کے پینل کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ میں پُراعتماد تھی اور چہرے پر سکون تھا۔ امیر ابن جاقم کے قبیلے کے سرکردہ لوگ بھی موجود تھے۔ ابتدا میں مجھ سے سادہ سوالات پوچھے گئے۔ پھر ایک ایک نکتے پر تفصیل سے سوالات کرنے کی اجازت دی گئی۔

(قسط: ۴۸)

Since 1990

MOTOLUX

INDUSTRIES

A GLOVES ENGINEERING COMPANY.

Motolux Street,Muzzafarpur, Ugoki Road,
Sialkot-51340,Pakistan,
Tel: +92-52-3252284,Fax: +92-52-3240216
info@motolux.pk

تجمل
Tajammal
TRAVELS (PVT) LTD.

IATA
ACCREDITED AGENT
IATA Code: 27342433

تجمل ٹریولز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

تجمل للسفریات (الخاصه) المحمدوده

ویزہ + ایئر لائن ٹکٹ

ہوٹل + زیارات ٹرانسپورٹ

UMRAH
عمرہ سروس

بجٹ پیکج
اکانومی پیکج

5
ہوٹل کی بکنگ

ٹی ایچ اے اوورسیز ایمپلائمنٹ پروموٹرز

شبعة تی ایچ اے ‹THA› لتطور الامور تتعلق بالعمال/الموعطفین الاجانب

THA
OVERSEAS EMPLOYMENT PROMOTERS
Licence No. 4189/LHR
‹خصة تسعة:۴۱۸۹/ایل ایچ آر

متحدہ عرب امارات، سعودی عرب، قطر
ملائشیا، میں ملازمت کے شاندار مواقع

- Labour Visa
- Skilled Visa
- Un Skilled Visa

thaoep1@gmail.com

رانا تجمل حسین
CEO

+92 300 6654 211
+92 302 1165 300
+92 321 6680 266
+92 41 2641 904

Office No. 54, Gate No. 5, Iqbal Stadium. Faisalabad. PK

جستجو کیا ہے۔؟

مرکزی خیال : آدمی نے ہر دور میں ٹائم اور اسپیس کی اہمیت کو جانا ہے۔ محققین کی کوشش رہی ہے کہ ٹائم اور اسپیس کی نفی سے بھرپور زندگی (Smart Life) گزار سکیں۔ لہروں پر مبنی اطلاعاتی و خیالی نظام آدمی کے لئے نیا نہیں، مصر اور مایہ کے اہرام ہنوز لہروں کے اسرار کی ہزاروں سال پرانی کاوشوں کا ایک زاویہ بیان کر رہے ہیں۔ گلیلیو، نیوٹن، میکس ویل، آئن اسٹائن، اسکروڈنجر اور ڈاکٹر عبدالسلام جیسے کئی نوبل انعام یافتہ محققین نے لہروں سے متعلق قوانین سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی۔ مادی طبیعیات سے گزر کر جب خیالات نے مابعد الطبیعیات پر کمند ڈالنے کی کوشش کی تو ان کا ذہن مصلحتاً مادے (matter) میں گرفتار رہا۔ زیر نظر مضمون میں تحقیقی رجحان کی دو سمتوں کا تذکرہ ہے۔ خارج میں یہ رخ آدمی کی حسی، عضلاتی، فعلیاتی اور نفسیاتی تفہیم سے گزر کر ذہنی نقوش بناتا ہے۔ آدمی نے ہر دور اور زبان میں ان نقوش کو اپنے مطابق نام دیئے ہیں۔ باطن یا حالتِ نیند میں بھی نقوش بنتے ہیں مگر یہاں مادی جسم کی شمولیت دکھائی نہیں دیتی۔ دونوں حالتوں میں فرق ٹائم اور اسپیس کی رفتار کا ہے۔ اگر آج کا محقق مادیت میں تبدیلی کو سمجھنا چاہتا ہے تو اسے مادے (matter) کی اسپیس کے پیچھے کارفرما 'زمانیت' (Time) کا علم حاصل کرنا ہوگا۔

ہر دیدہ نادیدہ شے جو حرکت میں ہے، اس کے اندر اضافیت شامل ہے۔ چاہے کوئی بھی تخلیقی زون ہو، شے میں تغیر اور فکشن کا سبب حرکت ہے۔ "ماہنامہ قلندر شعور" کے قارئین کے لئے یہ نئی بات نہیں، وہ حرکت کے دونوں رخ سے واقفیت رکھتے ہیں کہ اشیا کے وجود کا سبب بیک وقت محوری اور طولانی حرکات ہیں۔ اضافیت میں تبدیلی کے لاتعداد زاویے ہیں۔ مثلاً ہم وسائل اور تقاضوں کو اپنے سامنے گھٹتا بڑھتا دیکھتے ہیں، اس میں جسم شامل ہے۔

اولی الالباب ہستیوں نے ان طرزوں کو فکشن کہا ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ آدمی علمِ فکشن کو سب کچھ سمجھتا ہے لیکن علم الیقین کی جانب متوجہ نہیں ہوتا۔ قادرِ مطلق ہستی اللہ نے اس رجحان کو الہامی کتابوں میں جگہ جگہ بیان کیا ہے۔

"لوگو! تم کو زیادہ سے زیادہ مال سمیٹنے کی خواہش نے غفلت میں ڈالے رکھا۔ یہاں تک کہ تم نے قبریں جا دیکھیں۔ دیکھو! تمہیں عن قریب معلوم ہو جائے گا۔ پھر دیکھو! تمہیں عن قریب معلوم ہو جائے گا۔ دیکھو! اگر تم جانتے علم الیقین۔" (التکاثر: ۱۔۵)

الہامی کتب انکشاف کرتی ہیں کہ جنت میں نافرمانی کی وجہ سے حقیقت کو سمجھنے کی آدمی کی فہم پر پردہ آیا اور وہ زمین پر آ گیا۔ قدرت فرد کو عمر کے ہر دور میں انفرادی و اجتماعی تجربات کے ذریعے بار بار جہالت کے پردے سے نکلنے کی جانب متوجہ کرتی ہے مگر مشاہدہ یہ ہے کہ چمک دمک میں کھونے والا فرد حقیقت سے منکر رہتا ہے۔ ایسی روش پر گامزن افراد اور اقوام کو مثالوں سے سمجھایا گیا ہے۔

"دنیا کی یہ زندگی اس کی مثال ایسی ہے جیسے آسمان سے ہم نے پانی برسایا تو زمین کی پیداوار جسے آدمی اور جانور سب کھاتے ہیں، خوب گھنی ہو گئی۔ پھر عین اس وقت جب کہ زمین اپنی بہار پر تھی اور کھیتیاں بنی سنوری کھڑی تھیں اور ان کے مالک سمجھ رہے تھے کہ اب ہم ان سے فائدہ اٹھانے پر قادر ہیں، یکایک رات کو یا دن کو ہمارا حکم آ گیا اور ہم نے اسے ایسا غارت کر کے رکھ دیا کہ گویا کل وہاں کچھ تھا ہی نہیں۔ اس طرح ہم نشانیاں کھول کھول کر بیان کرتے ہیں ان لوگوں کے لئے جو غور کرنے والے ہیں۔" (یونس: ۲۴)

فی زمانہ کورونا اور ڈینگی وائرس کے نام سے بتائے جانے والے مہلک امراض کے تدارک کی کاوشیں نظر نہیں آتیں۔ آج محقق و موجد کا بڑا گروہ کسی ویکسین پر ریسرچ اور پروڈکشن کی بجائے 21 کروڑ کلومیٹر دور موجود مریخ کی ویران اور بنجر سطح پر لینڈنگ کو ترجیح دیتا ہے۔ سرمایہ کار ذہن نے تحقیق کے لئے فنڈنگ اور گرانٹ کے نام پر آدمی، حیوانات، نباتات اور جمادات کو تجربات کی بھٹی میں جھونک دیا ہے۔

بیسویں صدی کے نصف میں جاپان کے دو شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی کے ایٹمی دھماکوں

سے لے کر آج کے وائرولوجسٹ (قدرتی طور پر مفید وائرس میں تحقیق کرنے والے ماہرین) اور مالیکیولر بائیولوجسٹ کی جینیاتی تبدیلیوں کی داستان ابھی رقم ہونا باقی ہے۔ اس کو بیان کرنے کا مقصد سائنس و ٹیکنالوجی پر تنقید ہرگز نہیں۔

صاحبِ علم خواتین و حضرات الہامی کتابوں اور آخری آسمانی کتاب قرآن کریم کی روشنی میں فرماتے ہیں کہ ہر تخلیق اپنی اپنی اسپیس میں مخصوص مقداروں پر قائم ہے۔ بلاشبہ آدمی کو خالقِ کائنات اللہ کی جانب سے تصرف کی فہم حسبِ توفیق عطا ہوئی ہے — "عطا" کا مقصد کائناتی اکائیوں میں توازن کے فارمولوں سے آگہی بھی ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے،

> "اور یاد کرو جب اس نے تم کو قومِ عاد کے بعد سردار بنایا اور زمین پر آباد کیا کہ نرم زمین میں محل تعمیر کرتے ہو اور پہاڑوں کو تراش کر گھر بناتے ہو۔ پس اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو اور زمین میں فساد نہ پھیلاؤ۔"
>
> (الاعراف: ۷۴)

نکتہ یہ روشن ہوتا ہے کہ "عطا" کے سورس میں اضافیت یا شراکت کا کوئی پہلو نہیں۔ مثلاً ہنر اللہ کی عطا ہے، زمین اللہ کی عطا ہے — اسی طرح ترقی اللہ کی عطا ہے۔ اللہ چاہتے ہیں کہ جتنی نعمتیں ہیں، ہر فرد اپنی اسپیس میں ان کا بھرپور استعمال کرے اور دوسروں کو بھی فائدہ پہنچائے اور خیال رکھے کہ اپنے کردار سے کسی صورت اللہ کی زمین پر تباہی کا سبب نہ بنے۔

ذمہ دار دانشوروں اور محققین کا فرض ہے کہ تحقیق کے ایسے زاویوں پر توجہ مرکوز کریں جن کے مثبت اثرات زمین پر مرتب ہوں۔

بتایا جاتا ہے کہ آج آدمی سائنس اور اس کی اطلاقی ٹیکنالوجی میں اسمارٹ لائف گزار رہا ہے۔ دورِ حاضر سلیکان جیسی ریت کی ٹیکنالوجی پر مبنی ہے جس میں کمپیوٹر، موبائل فون، ٹی وی، دیگر برقی آلات، بلند و بالا عمارتوں کے بیرونی اور اندرونی شیشے، گاڑیوں کے پرزے وغیرہ شامل ہیں۔ محققین کے مطابق ریت کے ایسے ذرّے کو پانچ ارب ویں حصے تک ادھیڑا (تقسیم) جا چکا ہے۔ گھریلو اور صنعتی استعمال کی برقی اشیا اسی طرح ادھیڑ بن کی مخصوص مقداروں کی طے شدہ ترتیب سے بنائی جاتی ہیں۔

بائیوکیمسٹری، اناٹومی، فزیالوجی اور سائیکالوجی کے ماہرین آدمی کے ترکیبی عناصر کو پانی، لوہے،

نائٹروجن اور فاسفورس کی کیمسٹری بتاتے ہیں۔ نیوٹرل شعور کا طالب علم یہ سوچتا ہے اگر ہم ان عناصر کو ماہرین کی بتائی ہوئی ترکیب و ترتیب کے مطابق ملائیں تو کیا عناصر کے باہمی تعامل سے ایک چلتا پھرتا، بولتا، سنتا، سمجھتا آدمی بن جائے گا—؟ تاحال ریسرچ جرنلوں میں ہمیں کہیں ایسی تحقیق نہیں ملتی۔

سائنس اور اس کی اطلاقی ٹیکنالوجی میں جتنی ترقی ہوئی ہے، اس سے صحت کے پریشان کن معاملات سامنے آئے ہیں۔ متاثرین میں نوزائیدہ سے لے کر بوڑھے آدمی تک سب شامل ہیں۔ یرقان، ذیابیطس، بلڈ پریشر، مائیگرین اور الرجی وغیرہ ایسی بیماریاں ہیں جن میں عمر بھر دواؤں کی محتاجی ہے۔ آدمی سوچتا ہے کہ یہ امراض کا علاج ہے یا بزنس—؟

قارئین اتفاق کریں گے کہ صحت مند جسم، ذہانت، وسائل اور آئیڈیا یعنی خیال کی آمد کو آدمی کی محنت کا صلہ نہیں کہا جا سکتا— یہ کُلّی طور پر قدرت کا عطیہ ہے۔ قادر و قدیر اللہ نے قرآن کریم میں فرمایا ہے،

”ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر تخلیق کیا ہے لیکن وہ اسفل سافلین میں پڑا ہوا ہے۔“

(التّین: ۴۔۵)

اس آیت کی عربی کو لفظ بہ لفظ پڑھیں تو یہ بات روشن ہوتی ہے کہ اعلیٰ و ارفع ذات اپنی احسن تخلیق کا تعارف کرا رہی ہے کہ انسان میری بہترین صناعی ہے۔ سادہ لفظوں میں آپ کہہ سکتے ہیں کہ نباتات و حیوانات کے برعکس انسان کا آرکیٹیکچر احسن ترین ہے۔

پروردگار کائنات کے نائب کی حیثیت سے انسان کو کائناتی فارمولوں کا علم عطا کیا گیا ہے اور ان علوم کو استعمال کرنے کی اہلیت بھی دی گئی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ یہ اہلیت آدمی کے شعور کے پردے میں چلی گئی — مگر ایسا نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آدمی کو اکیلا چھوڑ دیا، خالقِ کائنات رحیم و کریم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسپیس میں قید آدمی کے لئے مددگار نظام ترتیب دیا ہے۔ اس نظام کے تحت گم شدہ اہلیت کے بحرِ بے کنار سے اکثر موجیں نیند اور بیداری میں آدمی کے شعور میں ظاہر ہوتی ہیں۔ یہ سب نعمتیں کس لئے ہیں؟ آدمی کو عمر کے ہر حصے میں تلاش اور جستجو کا خیال تواتر سے کیوں آتا ہے؟ (قسط: ۱۷)

نفیسہ شاکر

الفاظ کا اسیر

عموماً آدمی ایک دن میں ہزار سے زائد فیصلے کرتا ہے جن میں بیشتر غیر ضروری ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس بچہ فیصلہ کرنے میں کم وقت لیتا ہے اور اس کے فیصلوں کی تعداد کم ہوتی ہے۔

آدمی زیادہ کی خواہش رکھتا ہے۔ بسا اوقات یہ خواہش خود غرضی پر مبنی ہوتی ہے جو لالچ بن جاتی ہے اور لالچی شخص دوسروں کی ضروریات سے غافل ہوتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس کے اندر لالچ کے بیج نے کس لمحے جڑ پکڑی لیکن جذبات کے دباؤ کی وجہ سے وہ اندر کی آواز رد کر کے لالچ کو قبول کر لیتا ہے۔

زندگی میں تسلسل خواہشات سے ہے۔ معاشی اور معاشرتی نظام، جذبات کی تسکین اور تکمیل، تعلیم و تربیت، تحقیق و تلاش، ایجادات اور ترقی کے تانے بانے طلبِ صادق سے ملتے ہیں۔ زندگی تقاضوں پر قائم ہے۔ اگر آدمی اپنے سرمائے میں سے غریبوں کا حق ادا نہ کرے تو یہ لالچ ہے۔

لالچ آدمی کو وحشی بنادیتی ہے۔ ایک ترک شاعر نے اس کے نقصان کے بارے میں کہا ہے،

"لوگ لکڑ بگھے سے زیادہ وحشی ہو گئے ہیں۔
حال یہ ہے کہ اگر کوئی دانتوں سے محروم
ہو جائے تو اپنے بھائی اسے کھا جائیں گے۔"

لکڑ بگھا گوشت خور درندوں میں شمار ہوتا ہے۔ یہ گروہ کی شکل میں حملہ کرتا ہے۔ کئی دن بھوکا رہنے کے بعد جب شکار ملتا ہے تو بے صبری سے جھپٹتا ہے۔ شکار کو جگہ جگہ سے کاٹ کر زندہ چباتا ہے۔ جنگلی بھینسا اس کی پسندیدہ غذا بتائی جاتی ہے۔ جنگلی بھینسا کتنا خطرناک ہے، یہ جاننے کے لئے ان شکاریوں کی آپ بیتی پڑھئے جنہوں نے افریقا کے جنگلات میں وقت گزارا ہے۔

تحقیقی مقالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ لکڑ بگھوں کے کھانے کی رفتار اور تقسیم اتنی تیز ہے کہ زیبرا جیسے جانور کا 30 منٹ میں صفایا کر دیتے ہیں۔

لکڑ بگھے کے مختصر تعارف کا مقصد لالچ کے خواص کو بیان کرنا ہے۔ شاعر نے لالچی آدمی کو لکڑ بگھے سے زیادہ وحشی کہا ہے جو فکر طلب ہے۔

خواہش میں قناعت پسندی ہو تو دل لالچ جیسے منفی جذبات سے محفوظ رہتا ہے۔ لوگ زیادہ مقدار کو زیادہ سمجھتے ہیں جب کہ بڑے بزرگ کہتے ہیں کہ کسی شے کو زیادہ استعمال کرنے کے مقابلے میں اس کے کم استعمال سے زیادہ فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ Less is always more کی بات جس کی فہم میں آجائے، وہ کم وسائل میں بھی بہتر زندگی گزارتا ہے۔

زندگی کا انحصار ہمارے فیصلوں پر ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ عموماً آدمی ایک دن میں ہزار سے زائد فیصلے کرتا ہے جن میں بیشتر غیر ضروری اور باعثِ نقصان ہیں۔

کولمبیا اور اسٹین فورڈ یونیورسٹیوں کے ماہرینِ نفسیات نے "The Jam Experiment" کے نام سے ایک تجربہ کیا۔ انہوں نے فرد کے روز کئے گئے فیصلوں کی تعداد اور ہر فیصلہ کرنے میں صَرف کئے گئے وقت کے درمیان نسبت معلوم کرنے کی کوشش کی۔

تجربہ : بازار میں اسٹال لگایا جس میں 24 قسم کے جام رکھے۔ اگلے روز 18 جام ہٹا دیئے اور باقی چھ اسٹال پر رہنے دیئے۔ اگرچہ زیادہ جام والے اسٹال کا دورہ کرنے والوں کی تعداد زیادہ تھی مگر جب بات خریداری کی آئی تو جتنی فروخت چھ جام والے روز ہوئی، پہلے روز محض اس کا 10 فی صد فروخت ہوا۔ نتیجہ یہ رہا کہ جب انتخاب کے لئے اشیا کی تعداد بڑھتی ہے تو فیصلہ کرنے کا وقت طویل ہوجاتا ہے۔

جتنے غیر ضروری فیصلے ہم کرتے ہیں، اسی لحاظ سے وقت ضائع ہوتا ہے۔ اگر روزانہ کئے جانے والے فیصلوں کی تعداد کم کردی جائے تو کم وقت میں زیادہ کام ہوتا ہے اور کام کے بعد بھی کچھ اور کرنے کے لئے وقت بچ جاتا ہے۔

اگر ہم اچھی اور بامقصد زندگی گزارنا چاہتے ہیں تو غیر ضروری فیصلوں سے اجتناب ضروری ہے۔ مثال کے طور پر کس کپ میں چائے پئیں، کون سی خوش بو استعمال کریں، چھت پر جائیں یا ٹیرس میں بیٹھیں، آج کیا پکائیں—اس طرح کی چھوٹی چھوٹی باتیں بہت وقت لے لیتی ہیں۔ جہاں تک کھانا پکانے کی بات ہے، گھر والوں کی مشاورت سے ایک مہینے کی فہرست بنالیں۔ اس

سے روز ضائع ہونے والا وقت بچ جائے گا۔

ذہن میں ہجوم نہ ہو تو فیصلہ کرنے میں خلا کم سے کم ہو جاتا ہے۔ کامیاب لوگ غیر ضروری باتیں سوچنے میں وقت ضائع نہیں کرتے البتہ ضروری باتیں سوچنے میں بسا اوقات وقت ضرور لیتے ہیں اور ایسا معاملے کی نوعیت کی بنا پر ہوتا ہے۔ مثلاً وہ یہ نہیں سوچیں گے کہ میں کون سے کپ میں چائے پیوں اور کہاں بیٹھوں۔ ان کا مقصد کسی خاص جگہ بیٹھنا نہیں ہوتا، صرف بیٹھنا ہوتا ہے، وہ بھی صاف جگہ پر۔ بیٹھنا ان کے لئے ثانوی ہے، جس مقصد کے تحت بیٹھے ہیں، وہ اسے اولیت دیتے ہیں۔ ثانوی معاملات وہ معمول کی طرح گزارتے ہیں — اتنی اہمیت نہیں دیتے کہ یہ معاملات فیصلے بن جائیں۔

ماہرین کہتے ہیں کہ بالغ افراد کے مقابلے میں بچے فیصلہ کرنے میں کم وقت لیتے ہیں اور ان کے فیصلوں کی تعداد کم ہوتی ہے۔ بچے الجھن میں نہیں پڑتے، حال میں جیتے ہیں اور خوش رہتے ہیں۔ بچوں کی مثال بتاتی ہے کہ چیزیں جتنی کم ہوتی ہیں، فوائد کثیر ہوتے ہیں۔

اگر آدمی کو ثانوی اور بنیادی امور کا فرق سمجھ میں آجائے تو وقت میں برکت ہوتی ہے۔ مثلاً بالغ آدمی کو کہیں جانا ہو تو ذہن تقسیم ہونے کی وجہ سے دس مرتبہ سوچتا ہے کہ جاؤں یا نہیں۔ سوچنے میں ایک گھنٹہ لگ جاتا ہے اور بسا اوقات دن نکل جاتا ہے۔ دوسری طرف بچے کا ذہن تقسیم نہیں ہوتا — وہ جانے یا نہ جانے کا فیصلہ لمحے میں کرتا ہے اور خوش رہتا ہے جب کہ ثانوی امور کو اولیت دینے والوں کا ذہن آخر تک شک میں مبتلا ہوتا ہے۔

کم مصرف اور کثیر فوائد کی دوسری مثال کم بولنا ہے۔ زبان بظاہر گوشت کا چھوٹا ٹکڑا ہے مگر خیالات کی ترجمانی کے ساتھ اس سے بہت سے مقاصد پورے ہوتے ہیں۔ زبان کے بارے میں قرونِ وسطیٰ کے ایک فقیہ اور مصنف ابن القیم الجوزیہ کا قول ہے،

"زبان فرد کی سوچ کی ترجمان ہے۔"

زبان خیالات کے اظہار کے لئے نعمت ہے۔ کچھ لوگ اس کے زیادہ استعمال کو دانائی سمجھتے ہیں جب کہ دانا خواتین و حضرات کہتے ہیں کہ اچھی چیز کی زیادتی بھی نقصان دہ ہے۔

وسطی ایشیا کے ملک آذربائیجان کے شاعر اور فلسفی نظامی گنجاوی کا ایک قول ہے،

"اگرچہ پانی میں موتی جیسی پاکیزگی ہوتی ہے
مگر اس کا بہت زیادہ پینا نقصان دہ ہے۔"

ضرورت کے تحت بات کرنے والا نجات پاتا ہے اور زیادہ بولنے والا الفاظ کا اسیر ہو جاتا ہے۔ کم بولنے کے فوائد یہ ہیں کہ لوگ بات سنتے ہیں اور قدر کرتے ہیں، ذہن ہلکا رہتا ہے اور قوتِ برداشت میں اضافہ ہوتا ہے۔ کم گو شخص کے گرد ادب کی لکیر قائم ہو جاتی ہے جس کی ہر فرد پاسداری کرتا ہے۔ کم گوئی کا طریقہ یہ ہے کہ غیر ضروری تفصیل میں جانے کی بجائے کام کی بات کی جائے۔ منظر نگاری کو طول دینے سے وقت ضائع ہوتا ہے اور بات اثر کھو دیتی ہے۔ بات کرتے ہوئے اندر سے ملنے والے اشارے پر کان رکھیں۔ اندر میں آواز مستقل راہ نمائی کرتی ہے کہ کب بولنا ہے، کتنا بولنا ہے، کیا بولنا ہے اور کیا نہیں بولنا۔ اس سے قدر بڑھتی ہے جب کہ زیادہ بولنے سے قدر ختم ہو جاتی ہے۔

ایک صاحبِ فہم و دانش نے اپنے شاگردوں سے فرمایا، کیا میں تمہیں جسم کے لئے سب سے آسان اور لطیف عبادت بتاؤں—؟

شاگردوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

انہوں نے فرمایا، خاموشی اور اچھے اخلاق۔

معاشیات میں بھی یہ رجحان عام ہے کہ جب شے کی مقدار بڑھتی ہے تو قیمت کم ہو جاتی ہے اور جس شے کی قلت ہوتی ہے، اس کی قدر میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ زمین پر مٹی وافر مقدار میں ہے۔ اس کی قیمت سونے اور ہیرے کے برابر نہیں حالاں کہ مٹی سے ہی سونا اور ہیرا بنتا ہے۔ آج ایک تولہ سونے کی قیمت دو لاکھ روپے کی حد عبور کر چکی ہے جب کہ ایسا دور بھی گزرا ہے کہ ظروف سونے چاندی کے بنتے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ جب سونا زیادہ تھا تو کھانے کا برتن بنا اور جب سونا کم ہوا تو گلے کا ہار بن گیا۔

اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو بہت نعمتوں سے نوازا ہے—ان میں ایک نعمت غذا ہے۔ معاشرتی و معاشی نظام اس کے گرد گھومتا ہے۔

رازق و رحیم ہستی اللہ کا ارشاد ہے،

"اور کھاؤ، پیو اور حد سے تجاوز نہ کرو۔"

(الاعراف: ۳۱)

حد سے تجاوز کرنے کے معنی ضرورت سے زیادہ استعمال کے ہیں۔ اللہ نے فرمایا ہے کہ جو حد قائم کر دی گئی ہے، اس سے آگے نہ بڑھیں۔ حد یہ ہے کہ آدمی کھانا اتنی مقدار میں کھائے،

جتنا جسم کے لئے ضروری ہے۔ قدرت چاہتی ہے کہ ہم اپنے جسم کو جو دراصل ہمارا نہیں ہے، زیادہ کھانے سے نقصان نہ پہنچائیں۔

نقصان ہمیشہ زیادہ کھانے سے پہنچتا ہے۔ ہم کچھ کھاتے ہیں تو معدہ غذا کو توڑنے کے لئے توانائی خرچ کر کے خامرے (انزائمز) پیدا کرتا ہے۔ خامرے کیمیائی تعامل (کیمیکل ری ایکشن) بڑھا کر اور تیز کر کے ہاضمے میں مدد دیتے ہیں۔ زیادہ کھانے سے معدہ معمول سے زائد خامرے پیدا کرنے پر مجبور ہوتا ہے جس سے توانائی زیادہ صرف ہوتی ہے۔ اس کے برعکس مناسب مقدار میں کھائی گئی غذا تین چار گھنٹے میں ہضم ہو جاتی ہے۔ اس دوران میں دل بہتر طریقے سے اپنا فعل انجام دیتا ہے اور اسے کام کے ساتھ آرام کا موقع ملتا ہے۔ زیادہ کھانے سے نظامِ ہضم کے ساتھ قلب اور نظامِ اخراج پر اضافی دباؤ پڑتا ہے اور اثرات وقت کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔

"مصرف کم، فوائد کثیر" کے فارمولے سے کچھ امور مستثنیٰ ہیں جیسے قرآن کریم اور الہامی کتابوں کا مطالعہ، عبادت، اچھی تربیت، اچھے کام اور بلا تفریق اللہ کی مخلوق کی خدمت۔ زندگی کے ترازو میں ان اعمال کی کثرت ہمیشہ قلیل شمار ہوتی ہے۔ دوسری طرف وہ امور جن کا دائرۂ عمل محض فرد کی اپنی ذات اور ظاہری دنیا تک محدود ہے، اس کی کثرت نقصان دہ ہے۔

ماضی

ماضی میں کسی شخص نے جو فعل کیا ہو، اسے فعلِ ماضی کہتے ہیں۔ کرنے والا عموماً بھولنے کی کوشش کرتا ہے لیکن لوگ نہیں بھولتے۔ ماضی کی کئی قسمیں مشہور ہیں۔ سب سے مشہور "شاندار ماضی" ہے۔ جس قوم کو اپنا مستقبل ٹھیک نظر نہ آئے، وہ اس صیغے کو بہت استعمال کرتی ہے۔ جن لوگوں کا ماضی مشکوک ہو، وہ ماضی شکیہ کی ذیل میں آتے ہیں۔ جن لوگوں نے ریس میں یا تاش پر شرطیں بِد بِد کر اپنا ماضی تباہ کیا ہو، ان کے ماضی کو شرطی کہتے ہیں۔ چوں کہ ان کی تمنا ہوتی ہے کہ اور پیسے آئیں تو ان کو بھی ریس میں لگائیں اس لئے شرطی اور تمنائی دونوں ماضیاں ساتھ ساتھ آتی ہیں۔ ماضی کی دو اور قسمیں ماضی قریب اور ماضی بعید ہیں۔ ماضی کو حتی الوسع قریب نہ آنے دینا چاہئے۔ جتنی بعید رہے گی اور جتنے پردے پڑے رہیں گے، اتنی بھلی معلوم ہوگی۔ ماضی کا بعید رہنا مستقبل کے لئے بھی اچھا ہے۔ (اردو کی آخری کتاب)

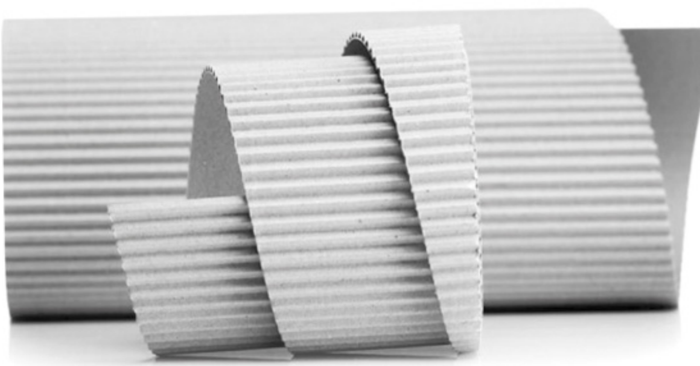

Manufacturer of
Liner & Floating Paper

PRIME PACK INDUSTRIES

C-21, S.I.T.E, Hyderabad
Tel: 022-3880627
Fax: 022-3880381

خواب تعبیر اور مشورہ

خوش بو

کرن حارث، کراچی: خواب میں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کی خواہش ہے، میں سفر میں ہوں لیکن ملاقات نہیں ہو سکی۔

تعبیر: اللہ قبول فرمائے، آمین۔ الحمدللہ خواب کی تعبیر درود شریف کے فضائل پر پھیلی ہوئی ہے۔ درود شریف پڑھنے کے دوران پاکیزگی اور پسندیدہ خوش بو کا اہتمام کیجئے۔

جنت کی خاتون

بی بی، اٹک: ایک بزرگ ہمارے گھر تشریف لائے اور کافی دیر قیام کیا۔ کسی کو ایک صاحبہ کا ناخن لگ گیا جس پر وہاں موجود ایک صاحب نے ناراضی کا اظہار کیا تو بزرگ نے فرمایا، انہیں کچھ نہ کہیں، یہ جنت کی خاتون ہیں۔

تعبیر: جو کچھ آپ نے خواب میں دیکھا ہے، میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو درود شریف پڑھنے کی اور زیادہ توفیق عطا فرمائیں، آمین۔

نماز کی پابندی کیجئے اور وقت پر نماز قائم کیجئے۔

دو رنگی

نسیم اختر، سفورا: بہن کے ساتھ ایک صاحبِ علم بزرگ سے ملاقات کے لئے گئی۔ وہ کمرے میں کرسی پر تشریف فرما ہیں۔ ہمارے پہنچتے ہی وہ اٹھے اور ایک میدان کی طرف چلنے لگے۔ ہم ان کے پیچھے روانہ ہوئے۔ میدان میں میز اور کرسی ہے جہاں وہ تشریف فرما ہوئے۔ میز پوش سفید ہے جس پر شیشے کی دو پیالیاں رکھی ہیں۔ ایک میں سفید اور دوسری میں گلابی پانی ہے۔ ہم دونوں میز کی بائیں طرف کھڑے ہو گئے۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت جی! میرا نواسا ہوا ہے، اس کا نام رکھ دیجئے۔

تعبیر: ظاہر ہوتا ہے کہ خواب دیکھنے والے کا ذہن منتشر رہتا ہے۔ کبھی دن اچھا لگتا ہے، کبھی رات میں شعور سو جاتا ہے۔ یہ دنیا رنگوں کی دنیا ہے۔ تلاش کیجئے کہ دنیا میں کوئی چیز ایسی ہے

جو بے رنگ ہے؟ آپ رنگوں کی کھوج لگا لیں تو مہربانی ہوگی۔ جو نتیجہ ہو، ادارے کو لکھ کر بھیج دیجئے۔ بچپن میں ایک شعر پڑھا تھا،

دو رنگی خوب نئیں یک رنگ ہوجا
سراپا موم ہو یا سنگ ہوجا

حقیقت

یمنیٰ، گلشن اقبال: ایسا لگا کہ میں خواب نہیں، حقیقت دیکھ رہی ہوں۔ دماغ میں اطلاعات وارد ہو رہی ہیں جس کی وجہ سے میں حقیقت جان گئی ہوں اور اب میں صاحبِ علم بن چکی ہوں لیکن آنکھ کھلتے ہی کوئی بات یاد نہیں رہتی۔

تعبیر: آدمی کا دماغ گراموفون کے ریکارڈ کی طرح ہے جو سوتے جاگتے، چلتے پھرتے، کھاتے پیتے مستقل مصروف رہتا ہے۔ خواب کے بنیادی کردار دو ہیں۔ ایک میں ابہام اور وسوسوں کی بھرمار ہوتی ہے۔ جو کچھ آدمی بیداری میں کرتا ہے، اس کا عکس دماغ کی اسکرین پر نمایاں ہوتا ہے۔ خیالات کا دوسرا رخ یقین پر قائم ہے۔ یقین اور ابہام بیک وقت دو ریکارڈ ہیں۔ یقین کی دنیا روشن ہے جب کہ شک اور وسوسوں کی دنیا یقین کے برعکس ہے۔ آدمی اچھے کام کرتا ہے تو اچھائی کا ذرّہ ذرّہ ریکارڈ ہوتا ہے۔ اس ریکارڈ سے آدمی کو سکون، خوشی، یقین اور امیدیں منتقل ہوتی ہیں۔ دوسرا رخ بے یقینی ہے جو ایک پورا نظام ہے۔ بے یقینی کی بنیاد شک ہے — شک شیطانی عمل ہے۔ اس عمل سے آدمی پریشان رہتا ہے جب کہ یقین کی دنیا دل میں سکون، امید اور خوف سے آزادی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے،

"آپ کیا سمجھے کہ علیین کیا ہے؟"

علیین راحت و آرام، چین و سکون، اطمینانِ قلب، خوشی، اللہ کا قرب، اللہ کے محبوب آخری نبی حضرت محمدؐ کے ارشادِ عالی پر عمل کرنا ہے۔ اس کے برعکس شک، وسوسہ، ڈر، خوف اور بے یقینی دنیا کا شجرہ ہے۔ ارشادِ باری ہے،

"آپ کیا سمجھے سجین کیا ہے؟"

آسائش و آرام ہوتے ہوئے سکونِ قلب سے محرومی، بے یقینی، بدحالی اور خوف کے نقوش ہیں۔ اللہ کے دوستوں کو غم و خوف نہیں ہوتا۔

آپ نے خواب میں زندگی کے اعلیٰ رخ کو دیکھا ہے۔

زعفران

ش۔ر،ن: روحانی بزرگ کے ایک عزیز نے ہمارے گھر سے ایک مکان چھوڑ کر گھر خریدا تو

ان سے ملنے گئی۔ ملاقات کے دوران معلوم کیا کہ بزرگ تشریف لائیں گے؟ تو صاحبزادے نے اثبات میں جواب دیا۔ جب دوبارہ ان کے گھر گئی تو بزرگ موجود تھے۔ میں نے ادب سے سلام کیا۔ انہوں نے مسکرا کر وعلیکم السلام کہا۔ اس کے ساتھ ہی منظر تبدیل ہوا۔ دیکھا کہ وہی بزرگ تشریف لائے ہیں اور ان کے ہاتھ میں زعفران ہے جو دے کر فرماتے ہیں کہ وضو کے بعد زعفران لگالیا کرو تاکہ ٹھنڈ سے بچی رہو۔

تعبیر: خواب کی تعبیر اچھی ہے۔ صفائی کا اہتمام کم ہے۔ خصوصاً سر کے بالوں کا دھیان رکھنا ضروری ہے۔ کھانوں میں گوشت کم مقدار میں کھائیے۔ صبح سویرے سیر کرنا آپ کے لئے بہت ضروری ہے۔ خالی پیٹ سیر کیجئے، اس کے بعد ناشتہ کیجئے۔

نیم دائرہ

عبدالحسیب، کراچی: ابو اور چھوٹے بھائیوں کے ہمراہ روحانی بزرگ کی محفل میں شریک ہوا۔ ہم سب نیم دائرے کی شکل میں بیٹھے ہیں اور سامنے موجود بزرگ کی بات سن رہے ہیں۔ ایک صاحب نے بزرگ سے کچھ معلوم کیا جس کا جواب ملنے کے بعد ان صاحب کے چہرے سے محسوس ہوا کہ وہ مکمل طور پر مطمئن ہو چکے ہیں۔ آخر میں ہم نے قریب جا کر سلام کیا۔

تعبیر: دماغ میں ہمہ وقت یہاں وہاں کے خیالات آتے رہتے ہیں۔ خیالات زیادہ تر دنیاوی معاملات سے متعلق ہوتے ہیں اور کبھی سچے خواب بھی نظر آتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے،

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

غور کیجئے خواب زندگی کا دوسرا پرت ہے۔ اس پرت میں اسپیس مغلوب ہوجاتی ہے۔ مغلوب ہونے سے مراد یہ ہے کہ زمین کے بھی رخ ہیں۔ ایک رخ اندھیرا (رات) ہے، دوسرا رخ روشنی (دن) ہے۔ جس رخ میں الوژن ہے اس میں خیالات کی لہریں متوازن نہیں ہوتیں، ان میں ٹوٹ پھوٹ ہوتی رہتی ہے، شکوک و شبہات چھائے رہتے ہیں۔

خواب کے دو نام بتائے جاتے ہیں۔

ا۔ رویائے کاذبہ ۲۔ رویائے صادقہ

خالقِ کائنات اللہ کے کرم اور خاتم النبیینؐ کی رحمت سے جب آدمی کا ذہن نیکی کی طرف مائل ہوتا ہے تو یہ رویائے صادقہ ہے۔

آپ کے خواب میں لکھی ہوئی تحریر رویائے

صادقہ کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ آپ، آپ کے والدین اور بھائی، بواسطہ سرور کائناتؐ، اللہ کی طرف رجوع کریں۔ خواب میں اطلاع ہے کہ الحمدللہ روحانی علوم حاصل کرنے کا ذوق ہے۔ سب کو سلام دعا۔

محل

زہرہ خان، گلستان جوہر: ایک خاتون نے گداگروں کی طرح کپڑے پہنے ہوئے تھے، مجھ سے کہتی ہیں کہ جاؤ، لوگوں کو کھانا کھلاؤ۔ میں کچھ لوگوں کو مسلسل کھانا کھلا رہی ہوں۔ اگلے منظر میں دیکھا کہ ایک جگہ جا رہی ہوں، راستے میں وہی خاتون نظر آئیں۔ میں انہیں کچھ پیسے دیتی ہوں تو وہ کہتی ہیں کہ جا اپنے محل کی صفائی کر، تجھے پیسہ ملے گا۔ کچھ دور چلنے کے بعد حسین محل دیکھا ــــ محل کے اندر گئی تو ایک بوڑھی خاتون صفائی کر رہی تھیں۔ جھاڑو مجھے دے کر بولیں، صفائی کر، پیسے ملیں گے۔ میں صفائی کر رہی ہوں مگر نظریں محل کی خوب صورتی پر ہیں۔ کچھ دیر بعد بوڑھی خاتون مجھے اس خاتون کے پاس لے گئیں جو پہلے ملی تھیں۔ وہاں ایک لڑکی بیٹھی تھی جس کا چہرہ نظر نہیں آیا مگر ایسا لگا کہ وہ بہت غریب ہے۔ میں اسے دیکھ کر رونے لگی تو فقیرنی بولی کہ اسے کھانا کھلاؤ۔ میں نے کھانا کھلا کر فقیرنی سے پیسے مانگے جس کا اس نے وعدہ کیا تھا مگر وہ اپنے ہاتھ میں کوئی چیز دکھا کر کہتی ہے کہ تیری ہے، تجھ ہی کو ملے گی، بس صبر کر۔ صبر کے بعد سب تیرا ہے۔

تعبیر: بندہ جب دل کی آنکھ سے اللہ تعالیٰ کی عنایت اور رحمت کے بارے میں دیکھتا اور سوچتا ہے تو اسے احساس ہوتا ہے کہ زندگی کا ہر لمحہ اللہ تعالیٰ کا محتاج ہے اور اللہ تعالیٰ سب کی ضروریات پوری کرتے ہیں۔ حالات اگر کبھی تنگ دستی کی طرف رخ کر لیتے ہیں تو آدمی کو اللہ کی دی ہوئی عنایات کو یاد کرنا چاہئے۔ چلنا، پھرنا، کھانا، پینا، صحت اور حالات بدلتے رہتے ہیں۔ دنیا میں مسلسل تبدیلی ہو رہی ہے جس کو یہ کہا جاتا ہے کہ کوئی تبدیلی نہیں ہو رہی۔

کثرت سے یاحی یاقیوم پڑھئے اور نماز کی پابندی کیجئے۔ ضروری ہے کہ قرآن کریم کی چھوٹی سورتوں کا ترجمہ پڑھئے اور یاد کر لیجئے تاکہ نماز میں یکسوئی ہو۔

رضا

عبدالوہاب، ٹنڈو محمد خان: ایک روشن چہرہ صاحب سے ملاقات ہوئی تو میں سلام کر کے

رونے لگا۔ انہوں نے سینے سے لگایا اور جنت دوزخ کے حوالے سے بات چیت کی۔ میں نے عرض کیا کہ مجھے آپ کی رضا چاہئے۔

تعبیر: خواب اچھا ہے۔ اسباق کی پابندی کیجئے اور وضو بے وضو چلتے پھرتے یا حی یا قیوم کا ورد کیجئے۔ رات سونے سے پہلے ایک تسبیح درود شریف کی پڑھ کر سیدھی کروٹ سو جایئے۔

دو مہمان

خورشید بی بی: دیکھا کہ مرحومہ بہن کی تعزیت کے لئے ایک خاتون آئیں اور گلے لگ کر رونے لگیں۔ پھر دو مہمان آئے جن کو صحن میں بٹھا کر کھانا پیش کیا۔ وہ لوگ کھانا کھا کر چلے گئے۔

تعبیر: خواب دو طرح کے ہیں۔ رویائے کاذبہ ایسے خواب ہیں جن میں illusion ہوتا ہے اور رویائے صادقہ میں الوژن کی جگہ یقین ہے۔

غلام صابر علی، سیالکوٹ — تعبیر: آپ بتائیں کہ ہم بتائیں کیا۔

انگور

ا۔ح، اٹک: گھر کے صحن میں کنواں موجود

ماہنامہ قلندر شعور جولائی 2023ء

آپ کے خواب اور ان کی تعبیر

پورا نام:........................ والدہ صاحبہ کا نام: ....

پورا پتہ:........................

ازدواجی حیثیت:............ وزن (تقریباً): .... آنکھوں کا رنگ............

نیند کیسی آتی ہے:............ بلڈ پریشر (نارمل/ہائی/لو):............ تاریخ پیدائش:............

میٹھا پسند ہے یا نمکین چیزیں زیادہ مرغوب ہیں؟............ فون نمبر............

خدانخواستہ دماغی، نفسیاتی مرض اور وہم کے مرض میں مبتلا ہوں تو ضرور لکھیں: ہاں / نہیں

مختصر حالات : ....

....

ہے جس کے برابر میں تین قبریں ہیں۔ کنوئیں کو بند کرنے کے لئے اس میں کچرا بھرنا شروع کیا۔ وہاں موجود ایک آدمی نے کنوئیں میں اتر کر برابر والی قبر میں سوراخ کئے۔ میرے منع کرنے پر بولا، قبر میں انگوروں کے گچھے ہیں۔

تعبیر: خواب اچھا ہے۔ وقت کی پابندی کے ساتھ رات کو سونے سے پہلے تنہائی میں بیٹھ کر تین سو مرتبہ درود شریف پڑھئے اور سیدھی کروٹ کان کے نیچے ہاتھ رکھ کر سو جایئے۔ ایک کاپی بنایئے۔ جو کچھ خواب میں دیکھیں، اس کو لکھ لیجئے۔ چلتے پھرتے وضو بے وضو یا حی یا قیوم کا ورد کیجئے۔

لاریب غفار، اسلام آباد — تعبیر: یہ خواب عقیدت کا اظہار ہے۔ نمازیں قضا ہوتی ہیں تو پانچ وقت نماز کی پابندی کیجئے اور رات کو سونے سے پہلے 101 مرتبہ درود شریف کا ورد کر کے بات کئے بغیر سو جایئے۔

سکون

منفی سوچ اتنی زیادہ عام کیوں ہے کہ آدمی اُن چیزوں سے خوش نہیں ہوتا جو اسے حاصل ہیں — ؟ ان خواہشات کے پیچھے کیوں سرگرداں ہے جن کے حصول میں وہ اعتدال کی زندگی سے روگردانی پر مجبور ہے — ؟ اس کا ایک ہی جواب ہے کہ ہم صبر و استغنا کی نعمتوں سے محروم ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ جو لوگ صابر و شاکر اور مستغنی نہیں ہیں، وہ فانی کائنات سے دور ہو جاتے ہیں — سکون و عافیت اور اطمینانِ قلوب دبیز پردوں میں چھپ جاتے ہیں۔ سکون اور خوشی کوئی خارجی شے نہیں ہے، یہ اندرونی کیفیت ہے۔ اس اندرونی کیفیت سے جب ہم آشنا ہو جاتے ہیں، سکون و اطمینان کی بارش ہونے لگتی ہے۔ بندہ اس ہمہ گیر طرز فکر سے آشنا ہو کر مصیبتوں، پریشانیوں اور عذاب ناک زندگی سے رستگاری حاصل کر کے اُس حقیقی مسرت اور شادمانی سے واقف ہو جاتا ہے جو بندوں کا حق اور ورثہ ہے۔

(کتاب: کشکول)

i

The Light Within Mankind

Life is a training ground. One can either sit staring aghast at the challenges that it brings forth or take a deep breath and attempt to overcome them. When one seems to be stuck in life, it only means that they have surrounded themselves with false notions or illusions. The reality however is completely different from the illusion that mankind remains gripped in. Let us decipher two common illusions that keep mankind engaged.

Illusion 1: "I have worked alone through the tough times in my life."

Contrary to this, there is not a single moment in time when mankind is left unattended, or not under the watchful eyes of God Almighty. When one believes that they have journeyed through life all alone, it only means that they have forgotten that their Creator and Sustainer God, is incessantly watching over them. This lack of faith in God as their caretaker stems from the inflated sense of self or ego which makes them assume that they are solely in charge of their well-being.

Illusion 2: "I feel stuck in the same situation; nothing seems to change around me."

This again is a belief that is far from true, because there is nothing that is unaffected by change in this material world. Mankind remains in the grip of these statements of hopelessness as they have no faith that their Lord Creator is working towards bringing in a greater impact in the universe through His plans for them. Mankind feels stuck each time life takes them in a direction that is not aligned with the direction they wanted to move in. Hafez, the renowned Persian poet writes,

> "I wish I could show you when you are lonely, or in the darkness, the astonishing light of your own being."

Let us understand the profound wisdom shared in this quote. The darkness that mankind feels surrounded by, is nothing but obscurity caused by their own ignorance. The poet urges mankind to look within themselves and unleash the light of wisdom that God has filled inside their hearts as His vicegerent. Instead of mankind looking up to external mediums such as people and things for a solution to their problems, if they called upon God to guide them to the light He has kept safe in their hearts, they would be awestruck at their inherent abilities to resolve anything and everything. It is time that mankind enjoys the brightness of their own light within their heart and soul.

ماہنامہ

روحانی ڈائجسٹ

کراچی

یہ پرچہ بندہ کو خدا تک لے جاتا ہے
اور بندہ کو خدا سے مِلا دیتا ہے

چیف ایڈیٹر: خواجہ شمس الدین عظیمی

مینیجنگ ایڈیٹر: ڈاکٹر حکیم وقار یوسف عظیمی

روحانی ڈاک میں آپ کے مسائل ومشکلات کا حل پیش کیا جاتا ہے۔

شعور کے پس پردہ لاشعور کی حقیقت کی پردہ کشائی کی جاتی ہے۔

خواتین کی زندگی کو پُرکشش، پرسکون بنانے کے لئے مضامین شائع کئے جاتے ہیں۔

بچوں کے لئے کہانیاں اور بہترین مستقبل کے لئے راہنما اصول بیان کئے جاتے ہیں۔

دین ودنیا کی خوشی حاصل کرنے کے لئے روحانی ڈائجسٹ ہر جگہ دستیاب ہے۔

the earth exists not only in this world but also in *Aaraf*, indicating the presence and functionality of time and space. The only difference is that when one leaves this realm, their speed increases.

The limitations and restrictions are determined by the dimensions of the realm in which a person resides. *Aalm-e-Nasoot*, our physical world, is a restricted space. But, while living here, mankind possesses the power of thought, which invites them to break free from this caged world.

It is in everyone's knowledge that the speed of thought equals the speed one experiences in the state of dreams.

Mankind lives two lives in a single span of time: Their body remains gripped in the clutches of time and space, while their thoughts stay free and independent of the material realm. The body belongs to the soil that created it and their thoughts originate from the point *(Roz-e-Azal)* where they became aware of their existence for the very first time.

The physical body, while confined in the material world, displays its capabilities. However, thoughts show the pathway to freedom from a life of material captivity. Contemplating the *speed of the body* and the *speed of thought* opens the mind to a deeper understanding of time and space.

❁ ❁ ❁

Signs

Occupied we all are in the extravagance of things.

Lost in the types and varieties each one of them brings,

The chaos we label knowledge, constantly leads us astray,

Declare: God created this world, and fastened night to day,

Lowering mountains to stabilise the land

Then the oceans, to cleanse the surface,

Innumerable creatures with imploration,

The lineage of prayers seeking a place,

In the secrets that float in infinite space.

Setting Earth upon the back of a bull,

Which rests upon a fish that dances on a roll,

Made of lights, as fine as air;

Seemingly resting on void, bare.

There is nothing that nothing can share.

Masks they are all at the behest of God,

Signs, that all there is, is the light of God.

Translation: Poem by —
Hazrat Fariduddin Attar[RA]

iii

meanings embedded within it. The agency that assigns meaning to this knowledge lies within each individual. When one descends into this world from the Realm of the Souls, the meanings of constraint and captivity are activated.

When one disconnects from their relationship with the body of flesh and bones and transitions to another realm, they wear another body that suits the environment of that realm. The meanings change as they transcend this world. For instance, time and space shrink or become nonexistent.

Aaraf is the place where souls reside. Similar to the material world, *Aaraf*, too, has land and houses. People eat, drink, sleep, walk, run, visit their relatives, experience happiness, and cry too. They also feel the warmth of the sun and the chill of the moonlight. All their experiences are within the constraints of time and space, however, their speed in carrying out their tasks improves.

❁ ❁ ❁

When an individual walks on foot, they experience the warmth or chill of the environment, feel urges of thirst and hunger, and can also feel pain and pleasure. But, when the same person who travelled at the speed of three miles per hour on Earth, sits in an airplane and covers thousands of miles in an hour, their urges remain functional, despite the change in time and space. Even though they have moved beyond the parameters of Earth, they are not free from urges.

> The physical body, while confined in the material world, displays its capabilities. However, thoughts show the pathway to freedom from a life of material captivity. Contemplating the *speed of the body* and the *speed of thought* opens the mind to a deeper understanding of time and space.

Being a creation entails dependency on urges, which are present in all realms. However, time and space vary in their fulfillment. The same holds good for *Aalam-e-Aaraf* too.

❁ ❁ ❁

Now, let us try to understand the difference in time and space in the material world and in the realm one enters after completing their time here.

Consider the case of Zaid. Let us say he died in Karachi while his relatives live in Lahore. He pays them a visit even after his death. When Zaid was alive, it would take him a day by train or approximately 3 hours by air to travel between the two cities. The mode of transportation depended on his financial means at the time of travel.

When Zaid transitioned to *Aaraf*, the distance between Karachi to Lahore shortened, despite the presence of the dimensions of time and space. This is because

flesh and bones, which is the physical expression of the being, perceives the information and ensures that the individual consumes bread and drinks water.

❁ ❁ ❁

The process of fulfilling bodily urges, be it in *Aalm-e-Nasoot*, *Aalm-e-Aaraf*, or paradise and hell, remains the same. Paradise is considered paradise because it has an endless supply of resources, including flowing streams of honey and milk, and other luxuries for our comfort.

Knowledge informs us that while on the one hand, an individual is constrained by physical limitations and it takes an hour for them to cover the distance of three miles, on the other hand, they are also free, because, with a single step, they can embark on a journey to the heavens.

Therefore, to claim that mankind cannot undertake a journey to the heavens and bow down before their Lord, or attain cognition of God, is nothing but ignorance.

Ironically, an individual sitting in Karachi can communicate with their relatives in Australia through the medium of light waves, just as they can interact with their acquaintances on their laptops and mobile screens while being in distant countries. However, when it comes to doing the same while employing their inner senses, mankind is clueless. We often consider our technological advancements to be the pinnacle of progress, but we remain confined to material resources. If one was aware of their inherent abilities, just as they created a television that broadcasts them, mankind would be able to project themselves anywhere in the universe with their will and intention.

What was once considered magic and fairy tale has now become a part of our daily routine. Mankind is a paradox. On one hand, they are constrained and unable to hear sounds from a distance of over 10 miles, but at the same time, they are free and equipped to hear voices from thousands of miles away through their inventions.

❁ ❁ ❁

Deep contemplation of the Quran reveals that food is available in both paradise and hell. Paradise provides milk, honey, and fruits that are appealing, while hell offers cactus, thorny plants, and other repulsive food items.

The knowledge of food exists in both places however, their meanings and connotations differ. In paradise, food carries positive implications that bring pleasure, while in hell, it generates sentiments of disgust, regret, pain, misery, woe, and sorrow due to the information that they carry within it.

In summary, the entire universe is knowledge, with different

i

Thought

Mankind lives two lives in a single span of time: Their body remains gripped in the clutches of time and space, while their thoughts stay free and independent of the material realm. The body belongs to the soil that created it and their thoughts originate from the point (Roz-e-Azal) where they became aware of their existence for the very first time.

Zaman-o-Makan, which translates to Time and Space, encompasses the entire universe, and everything happens within its confines. Just as a sparrow does not age before time, similarly, a seed does not grow into a tree before its time. The moon passes through time and space, assuming a crescent shape resembling the branch of a date palm, before transforming into a full circle. The shimmer of the stars is also confined within time.

Life, whether in *Aalm-e-Nasoot* (the material world), *Aalm-e-Aaraf* (the hereafter), *Aalam-e-Hashar-o-Nashr (the world of judgment)*, or paradise and hell, is driven by urges, and these urges are knowledge. Urges do not exist unless one has prior knowledge of them.

While hunger and thirst are basic urges in mankind, a 'human' has an urge for knowledge. Although humans experience hunger too, they remain desirous of knowing the underlying formulae and mechanisms behind these urges, rather than being solely engaged in their fulfillment.

If one is unaware of the sensations of hunger and the importance of food in the sustenance of life, one will not know what hunger is. Food represents knowledge that contains information about what is healthy and unhealthy. The collective term for all urges is knowledge. This principle applies to everything, be it, hunger and thirst, anguish and anger, love and hate, or states of sleep and wakefulness. Unless we possess knowledge about something, it does not exist or manifest before us.

Knowledge must have a point of origin, an agency where all the knowledge is stored and where meaning is attributed to it. Ultimately, this knowledge is manifested in the environment.

When one feels hungry, they are informed that their body needs food. The individual who receives this information interprets this knowledge and decides on what they should consume – bread or fruit, for example.

The actual being, that assigns meaning to this information, resides within the person, and it not only receives this information but also manifests it. The body of

V

⟐ Amina Faheem (Australia): Colour has two dimensions. While there is illusion in one, the other is true. Illusory colour is distance from the true colour, which is *Sibghatullah.* The example of this is every child who are all born in *Deen-e-Fitrat* (true colour), however, due to the presence of doubt in the environment, they become distant from it. My colour is an illusion in this world because I accepted illusion when I arrived in this world. In *Muraqaba*, I observed the blue colour closing after almost opening. There were subtle flickers one or two times. My mind was at great peace in these thirty days.

⟐ Ali Zia (Karachi): When a chameleon senses danger in its environment, it adopts the colours in its environment. Similarly, we adopt colours as per the environment too. When we are angry, we turn red, and we turn white when we are in fear. Our face glows in happiness, and turns yellow when we are anaemic. The observation of a blue colour remained on my forehead and appeared multiple times. At times the colour changed to gold or white.

⟐ Rehana Yousuf (Karachi): Colours refer to distance. In *Muraqaba*, at the level of my forehead, I observed a shining circle in which there was a collection of lights.

⟐ Konouz Sheikh (Abu Dhabi): While we are entrapped in time and space, we will witness a change in colours.

⟐ Farrukh Akram (Faisalabad): The base ingredients of creation are one, the difference is in the proportions. In *Muraqaba*, apart from observing various colours, the colour blue remained dominant. I observed faces that resembled cells; the outer wall was white, and inside it, were whitish boxes, just like those on a graph sheet. I had a thought that the universe is also made up of cells.

⟐ Imran Khan (Dubai): Based on distance, when creation is visible and divided as pieces, then this is called the demonstration of colour. We only see what our thoughts are concerned about. The reason why Majnu sees Laila is because his thoughts do not want to see anything else. The base for change in colours is the varied proportions. It is stated in the Holy Quran, "Praise the name of thy Lord, the Most High, Who createth, then disposeth; Who measureth, then guideth." (Quran, 87:1-3). Every proportion is a colour and the separation in colours is the difference in frequencies.

---

nal and external colours of the seeds, and pollen grains. Then there are changes in colours due to the change in the seasons, which create an increase in the shade of colours. The cells, elements, gases, air, words, concepts, emotions, health, and ill health, are all colourful and all these colours are in the water. There is nothing colourless here.

◈ Farzana Bano (Karachi): The universe is a collection of lights. Information descends in the form of light, however, as mankind is gripped in doubt, they see the colours instead of the light.

◈ Muhammad Umar (city unknown): Mankind is dependent on resources, both in paradise and on Earth. The pattern of certitude operates in the resources in paradise, whereas, on earth, mankind is gripped in doubt and the pattern of doubt dominates them, and hence, they see a change in resources. That is, to eat an apple one has to sow the seeds, after which, the tree takes years to grow, and only then bears fruit. Contrary to this, in paradise, one thinks of a fruit and it appears before them.

◈ Maryam Iftikhar (Rawalpindi): The change in colours is due to the proportions. The proportions are based on lights, which are based on the *Noor* of God. When mankind displaced their sight from *Noor*, they were overpowered by the colours of illusion.

◈ Bilquees Bano (Karachi): God's colour is His attributes. God loves us, overlooks our mistakes, protects His creatures, and also makes provision for their sustenance. God is free of needs. To adopt the colour of God, mankind must give up their expectations from creatures, become solely dependent on God, and remain in unconditional service to people.

◈ Muhammad Mohsin (Lahore): The change is inside us, and we see the reflection of this change within, in the things that are before us.

◈ Muhammad Tanveer Aalam (Islamabad): One attains energy by placing their certitude upon God. When in doubt, they live a life of entrapment. While on the other hand, space shrinks, when one is under the influence of certitude.

◈ Muhammad Amin Abid (Lahore): The system of paradise is, certitude. The minds of the inhabitants of paradise are aware that God is their Lord and that He is the Provider for all their needs. After coming down to Earth we assume that our professions and jobs are our providers.

◈ Bibi Anuradha (Dubai): Accepting God's colour means, negating illusory colours. One way of doing this is through the practice of gratitude. Those who are grateful, are coloured by the colour of God.

iii

change colours. About paradise, God states, “Its food is everlasting, and its shade.” (Quran, 13:35). In my Meditation, I witnessed that my mind was expanding and energy was entering it. At times I felt flickers of light. As a result of the exercise, I experienced a series of dreams and often met a spiritual person.

◈ Tahir Mahmood (Karachi): When mankind arrives in *Aalam-e-Nasoot* (the material world), they are overpowered by a layer of doubt (disobedience). This layer has been referred to as *Asfala-Safileen* (the lowest of the low). Due to this layer, there is a lens upon our eyes, which shows us illusion (a change in colours). As a result, we become distant from the true colour and are overpowered by illusion.

◈ Wafa Ansari (Bahrain): Accepting the colour of God, means adopting the thinking pattern - care of God. The change in colours is due to the proportions. When the colour of incertitude dominated the colour of certitude, mankind came to the Earth.

◈ Sadia Naz (Islamabad): We witness changes in everything that we see through the conscious senses. When the foundation of creation is hidden from sight, then whatever we see is an illusion or change.

◈ Yasmeen Gul (Faisalabad): Prophet Adam (PBUH) was enlightened by certitude in paradise. He was free from fear and grief and observed the true colour. By approaching the forbidden tree, certitude changed into doubt, and this gave rise to fear. In paradise, *Noor* (a stage of Divine Light) is dominant and the colours are subdued. On Earth, colours represent distance from reality. The journey from paradise to Earth, represents the journey of entering into a lack of certitude from a state of certitude.

◈ Naveed Ahmed (Ajman): In proportion to one’s compliance with the ordinances of God, one gains awareness of *Sibghatullah*.

◈ Syra Imran (Karachi): The mistake that we made by disobeying in paradise, is the reason why our true colour was hidden and we were overpowered by illusion. As of now, our colour is an illusion.

◈ Sadaf Faraz (USA): It is stated in the Holy Quran, “And whatsoever He hath created for you in the earth of diverse hues, lo! therein is indeed a portent for people who take heed.” (Quran, 16:13). The sky, earth, moon, sun, stars, planets, fruits, flowers, and our bodies, are all adorned with colours. We see these colours in various shades. A plant is a collection of various colours - the colour of the joints, the internal and external colours of the branches, the trunk, leaves, flowers, fruits, pulp, the inter-

now is an illusion. As per the exam stipulations, I strictly complied with the 30 days of meditation. In the initial days of meditation, by the grace of God, I was blessed by visitation.

⊙ Dr. Aisha Syed (Canada): Mr. Azeemi shared in his lecture that, “If there is white colour, it is white. You do not refer to it as red, blue, or yellow.” This proves that the change is not in creation, rather, it is in the eye of the observer. Based on the speed of consciousness, we see creation as big or small, growing or shrinking, and changing colours. When another colour is applied over a colour, the initial colour does not cease to exist, it is present in its original space. Through meditation, I witnessed a small bright moon moving around me and also outlines of flowers.

⊙ Gulistan Ahmed (Taxila): The body is made up of cells. The chromosomes in the cells are in fact the proportions of colours. Every proportion (colour) appears different from the other proportions, therefore, the material body that comes into existence through colours is a demonstration of the different proportions.

⊙ Dr. Samina Aamir (Lahore): The colours of the birds, trees, people, and leaves are manifestations of their attributes (proportions). The change in colours is based on the proportions. For example, the green colour of grass changes (first yellow, and then muddy brown) as soon as there is a change in the proportions of water in it. In the end, the grass scatters into pieces. In my *Muraqaba* (Meditation), I observed circles of subtle blue light coming toward me. The equation is:

The full proportions of water (light) = Green colour (lush grass)

Reduced movement (proportions) in water (light) = Yellow colour

Disconnection of water (light) from the grass = Decomposition of grass into particles

⊙ Nasira Khatoon (Mianwali): There is no change in colour. We are seeing the change. It is stated in the Holy Quran that the mountains are floating like clouds, however, mankind sees them grounded. This implies that we see illusion.

⊙ Aisha Ahmed (Ajman): The true colour does not change. To become familiar with it one has to align themselves to their ‘nature’.

⊙ Salman Sultan (Canada): The atmosphere of paradise is that of obedience and certitude. There are no evolutionary stages of the mind in paradise; everything is just as it is. The fruits do not rot there, nor do they

Results of the Test

On the occasion of Abdal-e-Haq Huzoor Qalandar Baba Auliya's (RA) *Urs*, on 27th January 2023, Mr. Azeemi delivered a lecture on the topic '*Sibghatullah* – The Colour of God', which was later published in the March 2023 edition of *Qalandar Shaoor Monthly*. Based on this, a question paper was formulated, and a total of 50 marks were assigned. We received hundreds of letters from Pakistan and other countries all over the world.

- Dr. Samina Aamir (Ph. D. in Physics) from Lahore secured first position with 42 marks.
- Chaitali Prabhu (current Masters in Psychology) from Dubai bagged second position with 40 marks.
- Engr. Salman Sultan from Canada and Engr. Imran Khan from UAE both stood third with 39 marks each.

Overall, the results are heartening. By the grace of God, no one failed the exam. Extra care was taken while verifying the answers to ensure that the paper was answered in the light of the guidance that was shared.

● Here are selected sections of the solved exam paper:

◈ Chaitali Prabhu (Dubai): Illusory colour is the distance from *Sirat al-Mustaqeem* (The Straight Path). Witnessing the changes in colour on earth is a reminder of our act of disobedience in paradise. The colours are not changing. We are seeing them with a mind that keeps changing. That is, the colours of the seed are fixed and are present in the seed. When we see it through limited sight, we only see the outer cover, while the internal characteristics remain hidden. When a seed sprouts into a plant and the plant grows into a tree, we notice the colours of each part of the tree separately. In truth, there was no change in the seed. The tree is in its absolute state inside it. The stages of development of the seed are an illusion due to the difference in time and space. My true colour is that upon which God has created me, however, the colour that I am in

iii

There is no distance between the universe and us. We see the distance as we have accepted the division of space. At times this distance manifests a space as a thousand moments, while at other times, a thousand segments of space merge in a single moment. That which introduces the millions of miles of distance to a moment is called *Idraak* (information).

What is *Idraak*? It is a dot. The expansion and contraction of the dot also represent *Idraak*. When the dot contracts, it becomes night, and when it expands, it is the demonstration of life during the day. These two aspects of *Idraak* are within us, and we pass through this cycle every day and night. The Holy Quran states,

"Thou causest the night to pass into the day, and Thou causest the day to pass into the night. And Thou bringest forth the living from the dead, and Thou bringest forth the dead from the living. And Thou givest sustenance to whom Thou choosest, without stint." (Quran, 3:27)

In the space of the night (sleep), the distances between the Earth and the heavens lose their significance, while in the daytime, space manifests through the waking of the physical body. When movement occurs through the physical body, space appears to be in segments, however, when we observe movement in the light of sight, space disappears. The transition from night to day and day to night is the transitioning of a smaller space into a larger space, and the larger space hides within the smaller space. This principle also applies to life and death. Death means dust turning into dust.

The readers are requested to read the '*Message of the Day*' with great attention and consider that the reflection of the physical body is visible as an image on the screen of the mind. What is an image, and what is its connection with the secrets revealed in the editorial?

The editorial contains facts about space — do read them with focus. The pages of the book will unfold in your mind. Initially, you will pass through a state of fog, after which, the light will bring clarity to the words. Write whatever comes into your mind and submit it to '*Qalandar Shaoor Monthly'*.

Understand this editorial in light of the following verse,

"Ah indeed! It is He that doth encompass all things." (Quran, 41:54)

May God protect you.

memories of ninety years in a moment. They delve into their childhood, talk about their adolescence, and remain lost in the memories of their adulthood. Ideally, what should have happened is that just as they traversed through the days and nights over ninety years and turned ninety years old, they should have passed through a period of ninety years to go back into their childhood too. However, this does not happen. Consequently, the prolonged space of ninety years, referred to as 'age' by mankind, becomes questionable.

2. Researchers say that the distance between the Sun and the Earth is 93,000,000 miles. According to this, it would take many hundreds of years to reach the Sun. However, when we observe the Sun traveling towards the west, our sight travels through a space of 93,000,000 miles in a moment.
3. We are seated ten steps away from the door. However, when we make an intention to step out, our sight reaches the door before we take the steps.

The way we perceive *space* is an illusion. What happens is that our body accepts the division of space whereas, our sight negates it. Whether it is the moon and stars millions of miles away, a glass of water within a foot or two, a book resting on the table, a pen kept nearby, a Peepal tree outside the window, a cuckoo singing on the topmost branch, or children playing in the shade, our physical body is dependent on every step we take to reach them. In contrast, our sight covers the distance in a single glance. For sight, the distance of a few inches and millions of miles, are the same.*

Pay attention to hearing, sound, and speech – we hear the sounds across the wall without physically crossing it. Before entering the garden, a fragrance informs us of the specific flower it belongs to. When a child calls out to their mother, their voice reaches her first, and the mother sees the child thereafter. When one remembers a friend they had met a few years back, the image of the friend forms in their mind, and within a short time thereafter, the doorbell rings. The experiences of the day and night demonstrate that every movement is bound to space, and is also negating space.

Law: When one walks, sees, or hears something, space encompasses their feet. If one becomes aware and observes that they walk, hear, and see due to the space that envelops them, then, they can familiarise themselves with the law governing the appearance and disappearance of space.

* It is said that the Sun is at a distance of 93,000,000 miles from the Earth and the Moon is at a distance of 250,000 miles.

Message of the Day

When an image from *Aalam-e-Baala* (the realm of souls) manifests in *Aalam-e-Zeere'n* (the earthly realm), it is referred to as 'the birth of a child' in this world. A child wails after its birth and if it does not, then efforts are made to make it cry. After three months, the child becomes capable enough to understand things and learns to speak through their parents. When the parents simplify the pronunciation of words for their children, the children giggle, listen, laugh, smile, observe the objects, and begin to recognise them. As a child steps into the threshold of consciousness, they learn to understand the events unfolding around them according to their mental capacity.

The consciousness of a child is a film that contains the vocabulary or record of the mother tongue. Since birth, a child has been listening to their mother tongue and learns to speak it by just listening to it. Whatever the child speaks and sees is in units of time which are then demonstrated in space. Everything that happens is recorded in one's memory with its time and space. For instance, let's consider a person who, with a focused mind, experiences the sound of rain in a pleasant environment. Months and years go by, and they become busy with the routines of the day and night. However, whenever it rains, upon hearing the sound of the water, their memory replays the scenes of the serene environment where they had previously heard the raindrops.

Every rainfall, much like the ripples in a pond, brings forth the moments and their memories (images), to the screen of mind. Although the rain is one, it is divided into the past and present due to the distance or gap of months and years between their occurrence. When the rain reoccurs in a different location, the two distinct moments become one.

• • ———————— • •

Moments are intervals, and an interval is defined as *Idraak* (information). *Idraak* can be understood as consciousness. Consciousness refers to the time and space taken to comprehend a message from the subconscious. The existence of a child is space, however, its birth, stages of development, the transition of day into night, and night becoming day, are all based on movement, which is time. Consciousness (*Idraak*) expresses the largest of intervals in the smallest of spaces, and spans the smallest of the spaces in the largest of intervals.

1. When a ninety-year-old individual recounts their past, they cover the

Contents

Message of the Day	K. S. Azeemi	138
Results of the Test	• • •	135
Thought	Momina Shahid	130
The Light Within Mankind	Shahzad Amir	125

"Behind the veil is a true world in all its glory, unaffected by the process of diminishing and growth."

Vol11 Issue6 | July 2023 | Dhul Hijjah – Muharram 1444 – 1445AH

بسم الله الرحمن الرحيم

Monthly Karachi

Qalandar Shaoor

Neutral Thinking

(Urdu — English)

Patron in Chief

Huzoor Qalandar Baba Auliya[RA]

Chief Editor

Khwaja Shamsuddin Azeemi

Editor

Hakeem Salam Arif

Circulation Manager

Muhammad Ayaz

Furnished by Azeemi University Press. Shah Alam Azeemi, the Publisher has published it at Ibn-e-Hasan Offset Printing Press, Hockey Stadium, Karachi and disseminated at Surjani Town Karachi.

Rs.130/- Per issue. Annual subscription Rs.1944/- with Reg. Post (Domestic), US$ 75/- (International)

Contact: B-54, Azeemi Mohalla, Sector 4-C, Surjani Town Karachi, Pakistan. Ph: +92 (0)213 6912020

NEST ESTATE ADVISOR
& Construction Management

پنجاب (پاکستان) اور جنوبی امریکہ میں کمرشل،
رہائشی اور منظور شدہ سوسائٹیز سے متعلق معلومات اور
لین دین کے لئے ہم سے رابطہ کریں۔

Muhammad Kamran Riaz

For Details, Contact : +92 334 4980 350

SANGAM HOTEL MUZAFFARABAD

HOSPITALITY IS OUR TRADITION

We serve famous delicious Cuisines, offer Air conditioned Rooms, Suites, well equipped Wedding and Conference hall and great Customer service.

Phone No: +925822444194-5 Fax No: +925822442587

Email:sangamhotel@hotmail.com

- Domestic/Commercial Independent solar systems
- Solar Powered Street Lights
- Solar Tube well pumps
- Hybrid solution for Telecom sector/BTS towers
- Large Scale Photo Voltaic plants

SOLAR SOLUTIONS

CCTV

COMMERCIAL

RESIDENTIAL

SAMSUNG

alhua TECHNOLOGY

We offer best IT solutions to meet your needs!

Cummins

Power Generation

DIESEL GENERATORS

GUIDELIGHT BUSINESS SOLUTIONS

We Offer Sustainable Solutions...

Jawad Tower, Block-B, 4th Floor, Flat # 6, University Road, Peshawar-Pakistan.**Ph#** 091-5711454

E-mail: info@gbs.com.pk , azeemi.moon@gmail .com **web:** www.gbs.com.pk

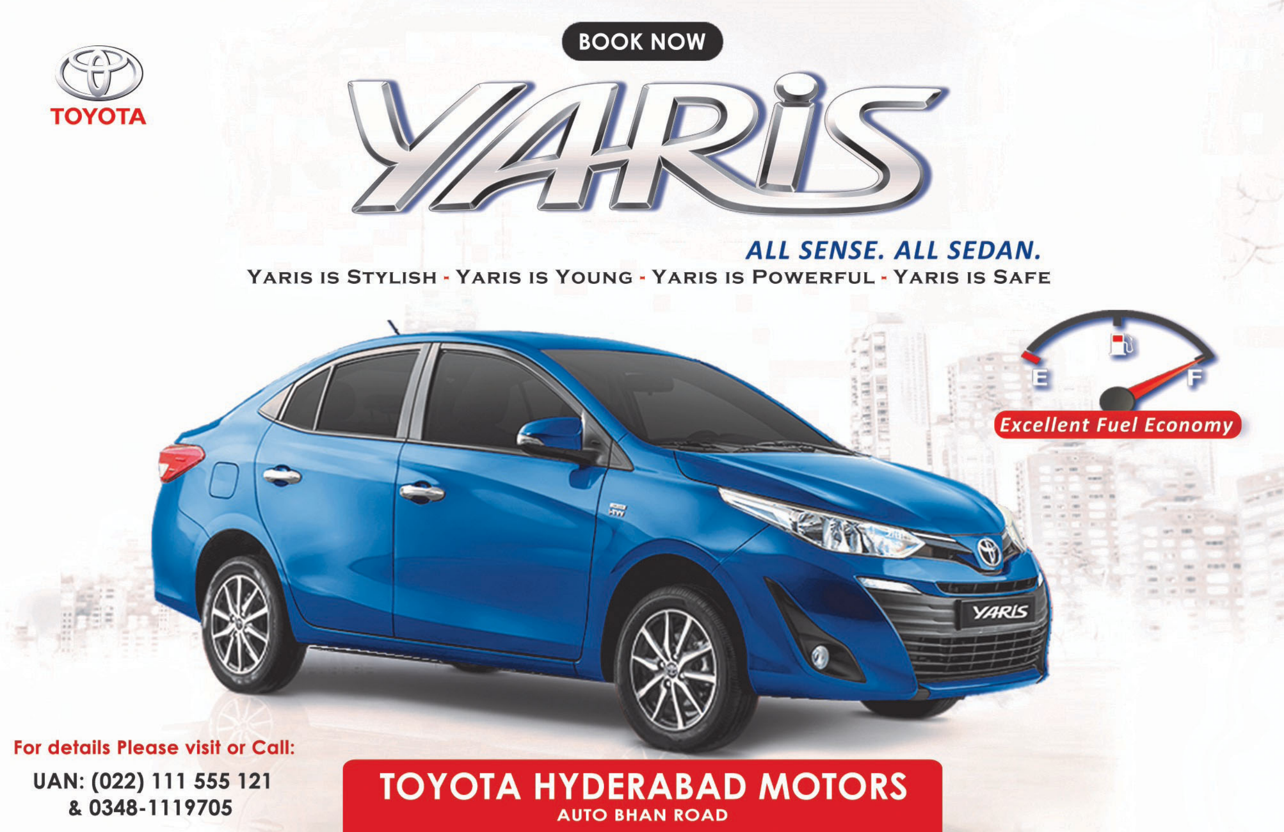
TOYOTA
BOOK NOW
YARIS
ALL SENSE. ALL SEDAN.
YARIS IS STYLISH - YARIS IS YOUNG - YARIS IS POWERFUL - YARIS IS SAFE
E
F
Excellent Fuel Economy
YARIS
For details Please visit or Call:
UAN: (022) 111 555 121
& 0348-1119705
TOYOTA HYDERABAD MOTORS
AUTO BHAN ROAD